فمن یّرد اللہ ان یّھدیہٗ یشرح صدرہٗ للاسلام

فلسفہ

تمدّنِ اسلام

مصنّفہ

عبدالباسط ایم اے ایل ایل بی

فیلو مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مُرتّب تسہیل الداستہ پسِ پردہ وغیرہ

پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

جس میں

نظریۂ تمدّن سے مکمّل بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی تمدّن دُنیا
کے تمدنوں میں بہترین اور عقل و ضرورت انسانی کے بالکل مُطابق ہے

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مُسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوا ۱۹۲۷ء ۱۳۴۶ھ

طبع اوّل ایک ہزار

قیمت فی جلد (عہ)

فلسفۂ
تمدنِ اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

ایک عرصہ ہوا میں بی اے کا طالب علم تھا میں نے ایک مضمون بعنوان "نظریۂ تمدن" حسب فرمایش فلاسفیکل سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تحریر کیا تھا۔ جو انجمن مذکور کے ایک جلسہ میں پڑھا اور پسند کیا گیا۔ بعد ازاں اسی سلسلہ میں ایک مضمون مقابلہ "فلسفۂ تمدن اور اسلام" کے عنوان سے جناب صدر انجمن میاں محمد شریف صاحب پروفیسر فلسفہ نے تجویز فرمایا۔ چنانچہ اس مبحث پر مجھے بھی کچھ لکھنے کی ہمت ہوئی۔ حسن اتفاق سے ممتحنان مقابلہ نے میرے مضمون کو بہت پسند کیا اور وہ تمغہ طلائی جو اسی مقابلہ کے لیئے تجویز کیا گیا تھا باتفاق رائے میرے ہی حصہ میں آیا۔ اس ہمت افزائی کے بعد مجھے جرأت ہوئی

کہ میں اسی مضمون پر نظر ثانی کر کے اس کو ایک مبسوط مقالہ کی صورت میں تبدیل کر دوں۔ چونکہ مجھے اس مبحث خاص سے ذاتی ذوق تھا اس لیئے بیحد جانفشانی اور ورق گردانی کے بعد خدا کا شکر ہے کہ وہ مقالہ اس قابل ہو گیا کہ کتاب کی صورت میں ہدیۂ ناظرین کیا جا سکے۔

قبل ازیں کہ اس کی اشاعت کا انتظام کیا جائے، میں نے مناسب سمجھا کہ اس کے متعلق دیگر ارباب فضل کا بھی مشورہ حاصل کر لوں۔ چنانچہ من جملہ اُن عُرفا کے جنھوں نے اس کی اشاعت کے متعلق راقم الحروف کی ہمت افزائی فرمائی مولوی عبد الماجد صاحب (فلسفی) اور سید سلیمان صاحب (ندوی) کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کتاب ہذا کے اکثر حصص باقساط معارف کے مختلف نمبروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اسی وقت سے احباب کا اصرار تھا کہ اس کو مستقل تصنیف کی حیثیت سے کتابی صورت میں پبلک کے سامنے پیش کیا جائے لیکن وہ مشکلات جو ایک مُصنّف کو بالعموم پیش آسکتی ہیں اِن سے میں بھی مستثنٰے نہ ہو سکا اور یہی وجہ ہے کہ کتاب کی اشاعت میں اس قدر تعویق ہو گئی۔

اِس موقع پر یہ بھی عرض کر دینا بے موقع نہ ہو گا کہ چونکہ بہ حیثیت ایک مستقل تصنیف

کے یہ میرا نقشِ اولیں ہے لہٰذا کسی لغزش کا ارتکاب بعید از قیاس نہیں ہو سکتا ممکن ہے حسب مفاد مقولہ عربی مَنْ صَنَّفَ فَقَدِ اسْتُهْدِفَ میں ارباب ذوق کی نگاہوں میں کسی فرو گزاشت کا جوابدہ قرار دیا جاؤں لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا خلوص جو اس تصنیف کا باعث ہوا ہے عذر خواہ بن کر میری برارت کی سند حاصل کر لیگا۔ اور موضوع کتاب کی اہمیت جزوی لغزشات کے دھبوں کو دامن کتاب سے محو کر دیگی۔

بقول ابن دُرید من لک؟ بالندب بالمهذب الذی + لا یجد العیب الیہ مختطے۔ فلسفہ تمدّنِ اسلام کی اشاعت کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اسلامی تمدن کے محاسن پر مادّیت نے جو پردہ ڈال دیا ہے وہ اُٹھا دیا جائے تاکہ اس کی اصلی اور حقیقی خوبیوں سے نگاہیں محروم نہ رہیں اور جو غلط فہمیاں اسلامی تمدن کے متعلق دلوں میں راسخ ہو گئی ہیں رفع ہو کر وہ روشن پہلو جس کو روحیت یا روحانیت سے تعبیر کرتے ہیں نمایاں ہو جائے۔

یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ صرف یہ مختصر تصنیف ہماری ضروریات تمدن کے لئے من حیث المجموع کافی نہیں بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کے قریب تر متعلقات پر بھی نظر ڈال کر احترام معاملات اور حُسن سلوک کے فرائض عامہ پر بھی پوری روشنی ڈالی جائے۔ لہٰذا اگر میری یہ پہلی کوشش کامیاب ہوئی اور اربابِ نظر نے ہمت افزائی فرمائی تو انشاء اللہ بہت جلد میں اس

بمبحث خاص پر بھی کچھ رائے زنی کی کوشش کرونگا اور ایک ایسا مکمل آئینہ جو تمدن اسلام کو اس کی اصلی صورت میں ظاہر اور نمایاں کر سکے پیش کردونگا۔

سب سے آخر میں طباعت کی زحمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صرف اس قدر عرض کردینا مناسب خیال کرتا ہوں کہ حسب مقولہ "قلم در کفِ دشمن ست" کتاب باوجود سعی بلیغ کے کتابت کی غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔ جن حضرات کو کاتب کی دست درازیوں سے سابقہ پڑ چکا ہے وہ میری کشمکش اور بیچارگی کا پورا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہمارے کاتبوں کو صرف غلط تحریر کرنے ہی کی عادت نہیں بلکہ بسا اوقات اپنی جودتِ طبع سے مجبور ہو کر اصلاح بھی کر دیا کرتے ہیں۔ لہذا اس سلسلے میں بھی جو غلطیاں رہ گئی ہیں اُن کا ذمہ دار بھی میں اپنے ہی آپ کو قرار دیکر عذر خواہ ہوتا ہوں۔

آخر میں میں اپنے مکرم دوست جناب سید محمد ہادی صاحب مچھلی شہری بی اے، ایل ایل بی کا بدل ممنون ہوں جنھوں نے اس ناچیز تصنیف کو اپنے مدلل اور عالمانہ مقدمہ سے مزین فرمایا ہے

گر بد و گر نیک فگندم بہ پیش

پوش بدامن بہ نکوئیِ خویش

راقم الحروف: عبد الباسط ایم اے، ایل ایل بی
فیلو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۸۔ اگست سنہ ۱۹۲۷ء

مُقدّمہ

میرے عزیز دوست مولوی عبدالباسط صاحب ایم اے، ایل ایل بی۔ جو ماشاء اللہ ابھی نوجوان ہیں علم ادب سے خاص دلچسپی اور شوق رکھتے ہیں آپ اُن باذوق فضلا میں سے ہیں جن کی ذات سے ادبِ اُردو کی آیندہ اُمیدیں بہت کچھ وابستہ ہیں۔ آپ نے جو کتاب فلسفۂ تمدّنِ اسلام کے نام سے تصنیف کی ہے اور جس کو اب شائع کرا رہے ہیں ادبِ اُردو میں ایک مہتم بالشان اضافہ ہے اور اِن فرایض کی ادایگی کی پہلی قسط ہے جن کا ہر تعلیم یافتہ مسلمان بہ حیثیت مسلمان ہونے کے ذمہ دار ہے۔

تعلیم کا یہ مقصد ہے کہ اس کے ذریعہ سے انسان اپنی اصلیت کو پہچان سکے نہ کہ اس منزلِ حقیقی سے اور بھی دُور ہو جائے۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے آج کل کی تعلیم کا نتیجہ مغربی حسیّات کی تقلید اور خود فراموشی کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارا نظریہ تعلیم اب صرف اسی قدر رہ گیا ہے کہ اہلِ یورپ کی تقلید کر کے ان کی صدائے بازگشت بن جائیں اور اپنی ہستی کو اُن کی ہستی میں اس طرح محو کر دیں کہ دُنیا کی نگاہوں میں ہم میں اور اُن میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے۔ جب ہمارے رجحانات، ہمارے محسوسات، اور ہماری اُفتادِ طبیعت کا یہ رنگ ہو تو اگر کوئی متنفس ہم میں سے محسوساتِ عامّہ کے خلاف اپنے پہچاننے کی کوشش کرے تو اُس کی حیثیت یقیناً ایک مجاہد سے کم نہ ہوگی اور اس لحاظ سے ہمارے عزیز دوست بھی جنھوں نے اس دورِ خود فراموشی میں اپنے کو پہچاننے کی کوشش کی ہے بلا تردید اس مبارک لقب کے مستحق ہیں۔

جہاں تک دیکھا جاتا ہے معاشی ترقی اور معادی معراج کا ذریعہ صرف دو چیزیں ہو سکتی ہیں۔ مادّیات اور روحیّات اور انھیں دونوں کے مناسب امتزاج کا نام اصلی اور حقیقی تمدّن ہے۔ مادّیت کا یہ کام ہے کہ معیشت اور گزران زندگی کے ذرائع پیدا کرے اور روحیت کا یہ فعل ہے کہ اس کے حدود قایم کر کے اسے بطرز

احسن مفید اور کارآمد بنائے۔ بغیر روحیت کی مدد کے مادیت تعدیل نہیں پیدا کر سکتی اور نہ اس کی مخفی قابلیتیں جو تمدن صحیح کا جزو لاینفک ہیں ظاہر ہو سکتی ہیں۔ اگر ہم اس کلیہ کو صحیح باور کر لیں تو ہم کو اپنے پہچاننے میں مطلق کوئی دقت نہ ہوگی اور ہم یہ بھی بتا سکینگے کہ آیا دیگر اقوام کی تقلید میں ہم حق بہ جانب ہیں یا نہیں اور اگر بعد تحقیقات ہمارا یہ جواب ہو کہ ہم حق بجانب نہیں تو ہمارے لیئے بہت آسان ہو جائیگا کہ تقلید محض کو بھول بھلیاں سے نکل کر منزل حقیقت کا پتہ لگا لیں اور اگر ہمارے مفلوج دست و پا اجازت دیں تو وہاں تک پہونچ بھی جائیں۔

"ہر کمالے را زوالے" ایک نہایت سچا مقولہ ہے۔ جس طرح بُری چیزوں کے رواج کا ایک وقت ہوتا ہے اسی طرح اچھی چیزوں کے عروج کا بھی ایک زمانہ ہوتا ہے اور جس طرح بری چیزیں بمقتضائے فطرت رفتہ رفتہ فنا ہو جاتی ہیں اسی طرح اچھی چیزوں کی بھی کساد بازاری ہو جاتی ہے مگر فرق صرف اس قدر ہے کہ بُری چیز کی فنائیت فنائیت حقیقی ہوتی ہے لیکن اچھی چیز کی معدومیت معدومیت اصلی نہیں ہوتی۔ اچھی چیز ہر ارتقائی یا تنزلی حالت میں بجنسہ موجود رہتی ہے وہ روپوش نہیں ہوتی بلکہ ہمارے حسیات کے تبدل کا کمزور پردہ تھوڑی دیر کے لیئے

اُسے نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ اور یہ دیکھنے کی ناقابلیت بھی حقیقی نہیں بلکہ محض مصنوعی اور غیر مستقل ہوتی ہے جس کا دور کر دینا بھی ہمارے ہی قبضہ قدرت میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر موجودہ تمدن میں کوئی کمی بھی نظر آئے تو ہمیں مایوس نہونا چاہیئے بلکہ اس وقت کا انتظار کرنا چاہیئے جب یہ خرابیاں خود بخود اصلاح پذیر ہو جائینگی۔

ہم مانتے ہیں کہ یورپ نے بہت کچھ ترقی کی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی ایجادات اور اختراعات محیر العقول ہیں لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ آیا اُن سے تمدّن حقیقی کو بھی کوئی فائدہ پہونچا ہے یا نہیں۔ اگر یہ چیزیں مدنیت کی کسوٹی پر بھی پوری اُترتی ہیں تو بے شک ہماری زبان کو کسی اعتراض کا حق حاصل نہیں۔ ورنہ مجبوراً ہمیں یہی کہنا پڑیگا ؎

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی

بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہووے

الغرض جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جو اقوام فی زمانا نہایت متمدّن سمجھی جاتی ہیں وہ موجودہ تنوعات کے محیر العقول پردے میں بجز چند نقلی تصاویر کے اور کچھ نہیں۔ آجکل کا تمدّن فی الحقیقت کوئی حقیقی اور

اصلی تمدن نہیں بلکہ اسی واقعی تمدن کا ایک بگڑا ہوا عکس ہے جس کو صدیاں گزریں مسلمان قایم کر چکے تھے۔ رہا تمیز نہ کرنا کہ اس کا ماخذ کیا ہے خود ہماری آنکھوں کا قصور ہے جن کو مصنوعی ترقی کی چکا چوند نے خیرہ کر کے ہمیں خالی الذہن بنا دیا ہے اور ہم شیشۂ عکس پودار کی طرح بلا تفریق و امتیاز حالت و حیثیت ہر اچھا برا نقش قبول کرنے کے لیئے تیار ہو گئے ہیں۔

صحیح اصول تمدن کے لیئے علاوہ اسباب معیشت کی تسہیل کی روحانیت کا ہونا بھی لازمی ہے اور چونکہ روحانیت کا دارومدار مذہب پر ہے لہذا کوئی قوم اپنے مذہب سے علیحدہ ہو کر کبھی صحیح معنوں میں متمدن نہیں بن سکتی۔ اگر اجزاے تمدن میں سے مذہبیت کا عنصر جو دیگر عناصر کا نقطۂ ارتباط اور ان کی صحت عمل کا ذمہ دار ہے حذف کر دیا جائے تو تمدن کا ہیولے کبھی اپنی اصلی صورت میں قایم نہیں رہ سکتا۔ اور ایسی حالت میں خود اس کے تمام اجزاے استعماری غیر مربوط ہو کر اس کے استہلاک اور معدومیت کا سبب بن جاینگے۔ چنانچہ بعینہ یہی حالت مغربی تمدن کی بھی ہے اگرچہ اس میں کچھ شک نہیں کہ اسباب معیشت میں بہت کچھ آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں مگر عنصر روحی کے منفک ہو جانے کی وجہ سے بالمآل ان کی فائدہ مندی نقصانات عظیمہ کا ماخذ بن گئی ہے۔ مثلاً

سائنس کی ترقی سے کسی کو انکار نہیں لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی علّتِ غائی کیا ہے تو ہماری تمام خوشیاں افسوس سے بدل جاتی ہیں۔ کیونکہ ان اختراعات روز افزوں کی محرک بجز اس خواہش قہرمانی کے جو ایک کثیر جماعت کی تخریب اور اعدام سے ایک قلیل طبقہ کی تکمیل مقاصد کا سبب بنتی ہے اور کچھ نہیں۔ آج کل صرف وہ قوم جس کے ہاتھ میں زیر دستوں کی تباہی اور بربادی کے بہترین ذرائع موجود ہوں اپنے معاصرین اور ہم چشموں میں متمدن تر سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ جس وقت تک جرمنی کے زیپلین اور اس کی میکسیم توپیں ملک الموت کا ہاتھ بٹاتی رہیں ہر مدعی تمدّن کی نگاہیں اسی کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کے اسباب قہرمانی کے فنا ہوتے ہی اس کی عظمت و استقلال بے نہایت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ وہ تمدن جس کی بنیاد صرف غرض رانی اور قہرمانی پر ہو اس کا انجام آخر الامر یہی ہوتا ہے لیکن وہ تمدن جس کی بنیاد روحیت پر ہوتی ہے یا جس کا ہیولیٰ مادیت اور روحیت کے باہمی امتزاج و تعدیل سے بنتا ہے یقیناً لا یعنی و لا یتغیر ہے۔ ممکن ہے زمانہ کی غبار آلود گردشیں تھوڑی دیر کے لیئے اس کے جمال جہان آرا کا پردہ بن جائیں لیکن اس کے استیصال پر کوئی قوت ہرگز قادر نہیں ہو سکتی۔

الغرض قوائے بہیمیہ اور خواہشات نفسانیہ کے ایک دل پذیر پیرایہ میں مظاہرے کا نام موجودہ تمدّن ہے۔ جس کے ریاکاری، دھوکہ، فریب، ظاہرداری اور خودغرضی اجزائے استعماری ہیں۔ موجودہ تمدّن کے نظریہ کے مُطابق، سیاہ کاری صرف اسی وقت تک سیاہ کاری ہے جب تک نگاہیں اس کا سراغ نہ لگا سکیں۔ ورنہ دُنیا کا کوئی عیب پردے کے اندر عیب نہیں رہ جاتا کون نہیں جانتا کہ وہ نازک ہستی وہ شرم و عفت کی دیوی جس کا نام عورت ہے اپنے حقیقی مرکز سے کس قدر ہٹی ہوئی ہے۔ وہ حسن و جمال جو کبھی اس کے مجازی خدا (شوہر) کا محدود سرمایہ تھا آج گلیوں اور بازاروں میں بےحجابانہ خود فروشی کرتا پھرتا ہے۔ یورپ میں مسابقۂ حسن و جمال کی ہنگامہ آرائیوں سے کون واقف نہیں۔ حسن کی نمائش گاہوں کے دلچسپ افسانے کس کے کانوں تک نہیں پہونچ چکے ہیں اور تھیٹروں اور دیگر تماشا گاہوں میں ان نوری لباس والی پریوں کے برہنہ خط و خال کون نہیں دیکھ چکا ہے۔ الغرض صنائع مستظرفہ کی ترقی نے ہر مخفی حسن کو آفتاب نصف النہار بنا دیا ہے۔ اور اگر احترام فطرت کا کچھ دنوں یہی رنگ رہا تو وہ زمانہ دُور نہیں جب جسم انسانی ہر آزاد چارپائے کی طرح لباس کے ہلکے سے ہلکے بار کا بھی متحمل نہ ہو سکیگا۔

امانت، صداقت، کفایت، محبت، اخوت اور رواداری کے نام دنیا سے مفقود ہو چکے۔ ہر بری چیز جو مقاصدِ شخصی کی راہ میں حائل نہ ہو بری نہیں اور ہر اچھی چیز جو افکار غرض رانی کی موئید نہ بن سکے قابلِ نفرت اور ملامت ہے دغا بازی اور فریب نے پالیسی اور حکمت عملی کا نام اختیار کیا اور غرور و تکبر خودداری اور سیلف ریسپکٹ کے نام سے موسوم ہونے لگے۔ چنانچہ اسلامی نقطۂ نظر سے رواداری، امانت اور بے کفایتی کے متعلق لایق مصنف کا نظریۂ ذیل قابل توجہ ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

(۱) "اسلام نے جس طرح آپس میں ہم مذہبوں میں اخوت پیدا کی اسی طرح غیر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ صلح و آشتی کی ہدایت کی ہے۔ اور ان کے لیے بھی جداگانہ قواعد منضبط کر دیئے ہیں۔ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح ایسے واقعات سے پر ہیں جن میں آپ یہود اور نصاریٰ کی شرکت فرماتے تھے۔ ان کے جنازوں کی مشایعت کرتے تھے۔ ان کی دعوت اور مجالس میں شریک ہوتے تھے۔ اور تمام وہ تمدنی معاملات قایم رکھتے تھے جن کی اسلام نے اجازت دی ہے۔

پھر وہی مسلم جب کسی ایسے شہر میں فاتحانہ شان و شوکت کے ساتھ
داخل ہوتے تھے جہاں کے باشندے اعتقاداً اور مذہباً مختلف
ہوتے تھے تو ان لوگوں کو کافی آزادی دیتے تھے۔ مسجدوں کے
سامنے گرجاؤں میں گھنٹے اور مندروں میں ناقوس کی اجازت
دی جاتی تھی۔ اور اسلامی تمدنی اصول کی پیروی میں دوسرے
مذاہب اور معتقدات کے اقوام جن کے ساتھ وہ سکونت اور
تعلقات قایم رکھتے تھے وہ فیاضانہ سلوک کرتے تھے جس کی
نظیر کی نوع انسانی کی تاریخ میں تلاش و جستجو لاحاصل ہے"۔

(۲) ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین سلطنتوں میں معاہدہ
ہوتا ہے، تو اس کی پابندی صرف اسی وقت تک کی جاتی ہے
جب تک ذاتی منافع حاصل ہونے میں یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر
ہوتا ہے لیکن اس کے خلاف عہد شکنی میں ذرا تامل نہیں ہوتا۔
لیکن ایک دیندار محض خدا کے خوف سے کبھی عہد شکنی کا خیال
بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اور معاد کا قائل مستقبل کے خوف سے
اپنے ایفائے وعدہ میں حتی الوسع کوشاں رہتا ہے۔

فرض کرو کہ دو شخص ہم سفر ہوں جن میں سے ایک کے پاس ایک ہزار (روپیوں) کے نوٹ ہوں اور دوسرا محتاج محض ہو اور راستہ میں متمول شخص کا انتقال ہو جائے اور مفلس کو اپنے ساتھی کا مال مل جائے اور اس کی خبر بھی کسی کو نہ ہونے پائے تو اُس وقت قوت اخلاقیہ اور نفس میں باہم جنگ ہو گی۔ اخلاق کا فتویٰ یہ ہو گا کہ روپیہ وارث مستحق کو دینا چاہیئے اور نفس کا فیصلہ اس کے بالکل برخلاف ہو گا۔ اس موقع پر محض اخلاقی تعلیم رہبری کبھی نہیں کر سکتی چونکہ مخلوق کے خوف کا اُس کو بالکل اندیشہ نہیں ہے۔ یہاں صرف وہی شخص بازی لے سکتا ہے جس کے دل میں خوفِ خلق کی بجائے خوفِ خالق جاگزیں ہو۔"

بہر حال جیسا کہ اوپر اشارہ ہو چکا ہے ہر چیز کے عروج کی ایک حد ہوتی ہے چنانچہ مغربی تمدن بھی خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا اپنی انتہا کو پہونچ چکا ہے۔ اور اس کے زوال کے اسباب ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ یورپ کے منورین اور متفکرین نے محسوس کر لیا ہے کہ ان کا موجودہ تمدن صحیح تمدن نہیں۔ جرمنی۔ امریکہ و دیگر ممالک متنورہ میں ایسی ہستیاں اب پیدا ہو گئی ہیں جن کے خیال میں تنہا مادیّت اصلی تمدن

کی کفیل نہیں بن سکتی - انکا قول ہے کہ جس طرح مشرق نے صرف روحیت کو اپنا مطمح نظر قرار دے کر اپنے کو برباد کیا - اسی طرح اب مغرب صرف مادّیت کو اپنا صید آمال تصوّر کر کے اپنی معدومیت اور تمامیت کا سامان مہیا کر رہا ہے لہذا ابقائے ذات کے لیئے لازم ہے کہ ایک درمیانی راستہ اختیار کیا جائے - اور روحیّت اور مادّیت کے امتزاج سے ایسے ذرائع ترقی پیدا کیئے جائیں جن پر کبھی اور کسی زمانہ میں کم مائیگی کا الزام عائد نہ ہو سکے اور جو ہر قسم کی ترقی انسانی کی بلا کم دست جولاں گاہ بن سکیں -

چنانچہ جناب مصنف اسی مسئلہ کے متعلق اہلِ امریکہ کے خیالات حسب ذیل عبارت میں تحریر فرماتے ہیں :-

"ہم روزانہ برائے العین مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض ایسے لوگ موجود ہیں جو جسمانی صحت سے متمتع ہیں دولت و ثروت میں قارون ثانی ہیں اور انھوں نے مختلف علوم و فنون کی زبردست تعلیم حاصل کی ہے - لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ہر وقت ان کو ایک قسم کی اندرونی گھبراہٹ اور دلی بے اطمینانی اور سخت بے چینی محسوس ہوتی ہے جو ان کی تمام راحتوں اور لذتوں میں کانٹے

کی طرح کھٹکتی رہتی ہے۔ ان کو اپنے دل میں ایسا تکدّر و ملال محسوس ہوتا ہے جس کا کوئی سبب ان کو بظاہر معلوم نہیں ہوتا۔ اور جو صرف اسی وقت زائل ہوتا ہے جب کہ مذہب کی شراب طہور کا ایک تسکین بخش گلاس ان کو مل جاتا ہے۔..............

چنانچہ ڈاکٹر گل امریکہ کے مشہور پروفیسر جو حال ہی میں ہندوستان بغرض سیاحت تشریف لائے تھے اپنے لیکچر میں فرماتے ہیں کہ امریکہ میں باوجود اس قدر تمول اب جس چیز کی ہر دل میں جستجو اور تلاش ہے وہ اخلاق، کیریکٹر یا مذہب ہے۔

ان کی رائے ہے کہ دنیا میں کوئی شخص خواہ وہ جسمانی، دماغی یا مالی کتنی ہی ترقیاں کیوں نہ کرے بغیر کیریکٹر یا مذہب کے ہرگز قابلِ قدر و منزلت نہیں ہو سکتا۔ اور ایک لامذہب سوسائٹی کے لیئے سم قاتل ہوتا ہے جس سے تمدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے"

الماٰل ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ یورپ کو اب اس کا کافی احساس ہو چکا ہے کہ ان کو بہت جلد موجودہ تمدّن میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیئے متعدد انجمنیں قایم کی گئی ہیں جن کا مطمح نظر وحدتِ خیال اور ہم آہنگی

ہے۔ من جملہ ان انجمنوں کے ایک انجمن، انجمنِ روحیات اجتماعی کے نام سے حال ہی میں بمقام برلن قایم کی گئی ہے علاوہ دیگر شعبوں کے اس کے شعبہائے فلسفی اور تصوفی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ شعبۂ فلسفی کے تحت میں جو مقاصد ظاہر کئے گئے ہیں اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ اپنے افکار و اعمال کو اس قوت عظمیٰ کی مرضی پر چھوڑ دینا جو کل عوالم کا منبع اور انسان کی روح جاوید ان کا مصدر ہے۔

۲۔ تمام ذی روح موجودات میں بلا لحاظ طبقہ و فرقہ باہمی ارتباط پیدا کر کے اُن کو عالم ملکوت کے ساتھ وابستہ کرنا تاکہ اخوت بین البشری کے اسباب پورے طور پر مہیا ہو سکیں۔

۳۔ نیکی کی خدمت نیکی کی حیثیت سے کرنا اور اس مقصد کے حاصل کرنے میں فکر سلیم اور عقل مستقیم سے کام لینا۔

۴۔ روح اور قوائے مخفیہ کی تکمیل کی کوشش کرنا تاکہ اس کے ذریعہ سے روحیت مادیت پر غالب آسکے۔

۵۔ تمام عزیز و اقربا اور ذی روح موجودات کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرنا

۶۔ امور مذہبی کو امور دنیادی کے ساتھ متحد و ممزوج کرنا۔

۷۔ دنیا کے تمام مذاہب کی عظمت کرنا۔

اس انجمن میں زندگی کے معنی کے متعلق جو تقریریں ہوئیں اُن میں سے ایک کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

اگرچہ زندگی ایک نہایت وسیع قابلیت کا نام ہے۔ مگر انسان اس کی صرف ادنیٰ ترین کیفیت کا احساس کر کے صرف اسی کو کام میں لا رہا ہے۔ زندگی کے حقیقی معنی ادراکِ ابدیتِ روح، تکاملِ بے حدود اور فنائے منیت کے ہیں اور اس کے حقیقی اغراض صرف قوائے سہ گانہ یعنی عقل، ارادہ اور محبت کے باہمی امتزاج سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

علاوہ اس کے شعبۂ تصوف کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ ایک خدا، ایک حقیقت اور ایک مذہب ہے۔ تمام مذاہب جو ازمنہ سابقہ میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں درحقیقت اسی واحد مذہب کے پرتو ہیں۔

۲۔ صرف ایک خدائے ابدی اور ایک وجود بے مانند موجود ہے اور اس سے خارج کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ لیکن انسان قبل اس کے کہ اس خدائے واحد تک جو مافوق ادراک بشری ہے پہونچ سکے محض اپنی کم بینی کی بنا پر

خداگانِ مجازی کو جن کا ادراک ممکن ہے اختیار کر لیتا ہے۔ وہ خیال جو خدا کی ذات کے متعلق کیا جاتا ہے ایک ایسا غنچۂ ناشگفتہ ہے جو صرف اس وقت شگفتہ ہوتا ہے۔ جب انسان کو اس کی (خدا) ذات کا ادراکِ حقیقی ہو جاتا ہے۔

۳۔ دنیا میں صرف ایک رہ نما ہے جس کو ہدایت کرنے والی روح کہتے ہیں اور جو اپنے پیروں کو ہمیشہ روشنی کی طرف جذب کرتی ہے۔

۴۔ دنیا میں صرف ایک اصول ہے جس کے معنی بغیر انحراف منزلِ حقیقی کی جانب براہِ راست چلنے کے ہیں اور اسی کے ذریعہ سے ہر روح کے قیام و دوام کا مقصد غائی حاصل ہوتا ہے۔

۵۔ صرف ایک قانونِ اخلاق ہے جس کو محبت کہتے ہیں اور جو "فدائے نفس" کی سرزمین سے ایک چشمہ کی طرح ابل کر اعمالِ نیک کا شیریں پانی اپنے گرد و پیش منتشر کرتا ہے۔

۶۔ صرف ایک حقیقت ہے جس کو معرفت ظاہری اور باطنی کہتے ہیں اور یہی تمام اسرار اور حکمات کا جوہرِ حقیقی اور پرتو اصلی ہے۔

۷۔ مذہب اتحادِ باہمی کی تلقین کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے انسان اپنے نفس اپنے محیط اور اپنے خدا کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے اور اس توافق

باہمی کی بنا پر اپنے نفس اور اطراف عالم میں ایسی روشنی پھیلائے جس کے ذریعہ سے جمال کے درجاتِ عالیہ اور وحدت و محبت کی بلندیاں نصیب ہو سکیں۔

حافظ

گر نورِ عشقِ حق بدل و جانت اُفتد — باللہ کز آفتاب فلک خوبتر شوی
دست از مسِ وجود چو مردانِ رہ بشوی — تا کیمیائے عشق بیابی و زر شوی

کیا اِن خیالات اور حسیّات پر غور کرنے کے بعد کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ تعلیمات، تعلیماتِ اسلام کا جزو نہیں۔ ہمارے قابل مصنف نے بھی اِسی نظریہ کے متعلق جابجا بہت دلچسپ بحث کی ہے جس کے پڑھنے کے بعد کوئی شخص اسلامی تمدن کی غیر محدود برکات سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

(۱)۔ یہ امر تو اظہر من الشمس ہے اور اپنے دعوے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں رکھتا کہ مسلمانوں کے تمدن کی بنیاد جزیرہ عرب میں قایم ہوئی اور بہت ہی قلیل عرصہ میں اس کی شاخیں تمام ممالک شرقیہ اور مغربیہ میں پھیل گئیں۔ تمدن کا وہ تخم جو اسلام نے عرب کی اُو سرزمین میں بویا تھا اور جس کا پودا

ابھی نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ ہر چہار طرف سے اس کی بیخ کنی میں انتہائے سعی لاحاصل ہوئی اور بالآخر وہ تمام انسانی مخالفتوں میں روحانی نصرت سے سرسبز ہوکر نخل بار آور ہوا اس کی روشن دلیل ہے کہ یہ ہمیشہ کے لیئے ہے۔...............................

یہی وہ شجر بار آور ہے جس کے شیریں ثمرات سے نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ تمام ذی عقل اقوام آج فائز المرام ہو رہی ہیں اور ان اصول تمدن پر کاربند ہوکر مہذب دنیا میں آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہی ہیں اور تمام ان اقوام کو جنھوں نے ان زریں اصول کو چھوڑ دیا ہے یا ان کی پیروی میں مذہبی تعصبات سے عدم توجہی کی ہے۔ غیر مہذب اور غیر متمدن ہونے کا طعن دے رہی ہیں۔

تواریخ اور علوم تمدن کا استقرار کرکے ہر شخص اس امر پر استدلال کرسکتا ہے کہ مسلمانوں کا تمدن تمام دنیا کے تمدنوں کی نسبت زیادہ سریع السیر، زیادہ شاندار، اور عجیب قوی اثر رکھنے والا اور ہر قسم کی تمدنی صلاح و فلاح کا جامع ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی حالت پر منصفانہ سرسری نظر ڈالنے سے یہ تمام باتیں مجسمہ بن کر آنکھوں

کے سامنے آجاتی ہیں۔"

(۲)۔ واقعات زمانہ اور علوم وعقول اس دعوے کی تائید کرتے ہیں کہ مذہب اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو در اصل طبعی کہلائے جانے کا مستحق ہے یہاں تک کہ موجودہ بیسویں صدی میں جو ہر لحاظ سے متمدن اور مہذب سمجھی جاتی ہے اس کے نصوص آفتاب سے زیادہ روشن ہو گئے ہیں اور جس طرح شعاع آفتاب پانی میں سرایت کر جاتی ہیں اسی طرح وہ نصوص عقول انسانی میں نفوذ کر جاتی ہیں کوئی قاعدہ جو تجربات انسانی سے ثابت ہوا ہو اور کوئی نظریہ جو حواس خمسہ نے قایم کیا ہو ایسا نہیں پایا جاتا جو انسانی تہذیب اور شائستگی کی ترقی میں موثر ہو اور وہ کسی نص قرآنی یا احادیث نبوی کی صدائے بازگشت نہ ہو۔

اگر ذرا غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمائے روئے زمین جس قدر انسانیت کی شان کی ترقی میں سعی بلیغ اور کوشش نامتناہی کرتے نظر آتے ہیں اُن کا مقصود صرف یہی ہے کہ مذہب اسلام کے قواعد کی صحت اور صداقت پر دلائل و براہین قایم کریں"

الغرض جیسا کہ بار بار اوپر ذکر ہو چکا ہے اس امر کا ثبوت کہ اچھی چیز گو موقتاً نگاہوں سے تھوڑی دیر کے لیئے اوجھل ہو جائے مگر اس کا فنا ہو جانا قطعاً ناممکن ہے خود متمدنان یورپ کی بیداری سے ملتا ہے۔ یورپ نے اگرچہ مشرقی اخلاق کی تقلید سے اپنے لیئے اسباب ترقی فراہم کیئے لیکن آخر کار وہ راہِ راست سے بھٹک گیا۔ اور جب اُسے اس میں بجز پرخار وادیوں کے کچھ نظر نہ آیا تو پھر اسی گلستانِ حقیقت کی جس کی تازگی اس کی سرسبزی کا باعث ہوئی تھی یاد پیدا ہوئی۔ چنانچہ وہ بیدار ہو گیا۔ لیکن ہم ابھی تک اُسی خواب غفلت میں ہیں اور حقیقت سے دُور ہو کر ایسے خارزار میں چکّر لگا رہے ہیں جہاں نہ تو ہمارے پاؤں ہی تھکتے ہیں اور نہ ہم کو اپنے اصلی ملجا کی طرف مراجعت کا خیال ہی پیدا ہوتا ہے۔ ہماری حالت کا اندازہ جناب مصنف کی مندرجہ ذیل عبارت سے جس میں اُنھوں نے اسلامی تمدن کے انحطاط کا ماتم کیا ہے بخوبی ہو سکتا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :-

"اخلاف اپنے اسلاف کے ان عظیم الشان کارناموں سے بالکل بے خبر ہیں اور تمام علوم مشرقیہ اور عالمان شرقی جو کسی زمانہ میں تمدن کا سرچشمہ تھے اب کمال عروج دکھا کر علوم مغربیہ کے اُفق

میں غروب ہو چکے ہیں اور عالمانِ مغرب نے اس طرح ایک خوشنما منظر
عالم کے سامنے پیش کر دیا ہے جس طرح کہ آفتاب نظر فریب اپنی تمام
دن کی چمک دمک دکھا کر شام کو قریب الغروب اُفق پر ایک خوشگوار
منظر پیش کرتا ہے۔ کوتاہ بین اُسکی فضا میں ایسے محو ہو جاتے ہیں
کہ اس کے اصل منظر کو فراموش کر دیتے ہیں اور اس ظلمت سے
بے خبر ہو جاتے ہیں جس کا وہ پیش خیمہ ہے۔ علومِ مغربی کی ظلمت نے
ہماری چشم بینا پر ایک پردۂ تاریکی ڈال دیا ہے اور زمانہ کے
متعدد پردے اس طرح درمیان میں حائل ہو گئے ہیں کہ ہم ان واقعات
سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ اور اس آخری جھلک کو اپنا معیار
اصلی تصور کرنے لگے ہیں۔"

مختصر یہ کہ ہمارا باغ پائمال ہو گیا۔ ہماری دولت لوٹ لی گئی اور
اب ہماری یہ حالت ہے کہ اپنی دولت کے لوٹنے والوں کی طرف دستِ
تگدّی دراز کئے ہوئے ہیں اور کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ وہی متمدنانِ عالم
جو کل تک ہمارے دست نگر تھے اور ہمارے خوانِ نعمت کے چھوٹے سے چھوٹے
ریزے کو بھی اپنا سرمایۂ حیات سمجھتے تھے آج ہماری طرف چشمِ حقارت سے

بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے، اور ہم ہیں کہ ان کے ہر نقش قدم پر جان و ایمان قربان کرنے کے لیے تیار رہیں ؎

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

میں نے خود عجیب عجیب انقلابات اپنی زندگی میں دیکھے ہیں۔ پہلے مذہبیات ہماری تعلیم ابتدائی کا جزو اعظم تھیں۔ ہر بچہ کے لیئے دینیات اور قرآن شریف کی تعلیم نہایت ضروری اور لازمی خیال کی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ اس طرح مسدود ہو گیا کہ آج سو میں مشکل سے ایک ایسا ملیگا جس نے دیگر مذہبی کتابوں سے قطع نظر کر کے کلام پاک کی ایک آیت بھی سمجھ کر پڑھی ہو۔ ایسی حالت میں جب کہ ہمارے دل کا آئینہ نقوشِ اسلامی سے معرّا ہو چکا ہے، مصنوعی شمس ترقی کی ضو فشانیاں ہماری آنکھوں میں جو کچھ چکا چوند پیدا نہ کریں کم ہیں۔ ہمارے پاس اب بجز اس کے کہ "پدرم سلطاں بود" اور کیا باقی رہا۔ اتنا تو ضرور جانتے ہیں کہ مسلمان کبھی دنیا میں کوس "لمن الملکی" بجا چکے ہیں لیکن یہ نہیں خبر کہ وہ ترقیاں اور ان کے ماخذ کیا تھے۔ الغرض ہم فنا ہو گئے اور اپنے ہی ہاتھوں اور اپنے ہی غفلت کے نتیجوں سے۔

اب ہمارا بطور خود ابھرنا قطعی ناممکن ہے۔ ممکن ہے وہی اقوام جو ہم سے ہمارے اسباب ترقی چھین چکی ہیں کبھی ان کے روحی پہلو پر نظر غائر ڈال کر (جس کی ابتدا خدا کا شکر ہے ہو چکی ہے) مستفید ہوں اور بہ سلسلۂ قبول اسلام ہمارے حلقۂ جامعیت کی وسعت کا سبب بنیں۔

الغرض جو کتاب ہمارے فاضل دوست نے انتہائی جاں فشانی مطالعہ اور ورق گردانی کے بعد تصنیف کی ہے یقیناً ہندوستان میں ان افکار عالیہ کی پیش آہنگ ہے جو اہل یورپ کو اپنی جانب کشاں کشاں لیئے جا رہی ہیں

خدا سے دعا ہے کہ ہمارے لائق مصنف کا یہ بیش بہا نقش اولیں مقبول و مشکور ہو کر ارباب نظر کے لیئے سرمۂ بصیرت بنے۔ آمین

خاکسار

ہادی مچھلی شہری

نظمیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لمن قدّرہ خیراً و جلالا
والشکر لمن صوّرہ حسناً و جمالا

تمدّن

انسان جب اس عالمِ فانی میں اوّل مرتبہ قدم رکھتا ہے اور آنکھ کھولتا ہے تو وہ اس تماشا گاہ اور اس کے بازیگروں کے حرکات و سکنات کا دلدادہ اور اس کے شعبدوں اور کرشموں کا تماشائی ہوتا ہے گویا وہ زبانِ حال سے سوال کرتا ہے کہ میں کہاں آیا اور کیوں آیا؟ اور میری یہ انفرادی ہستی ایسی عظیم الشان دنیا میں کس کام کی انجام دہی کے لئے پیدا کی گئی ہے؟ کچھ عرصہ تک تو یہ مسئلہ بہت پیچیدہ اور لاینحل معلوم ہوتا ہے لیکن تھوڑے ہی زمانہ میں صحیفۂ فطرت اس کی عقدہ کشائی کر دیتا ہے اور انسان پر بہت جلد ان امور کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ صحیفۂ فطرت کا مطالعہ

یہ سبق دیتا ہے کہ جب تک بھی وہ اس عالم میں ہے اس کو اس عالم کی چیزوں سے ساز باز کی ضرورت ہے۔ جوں جوں غور و خوض کرتا ہے اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے گل مقصود کی تکمیل کا راستہ بالکل بے خار نہیں ہے بلکہ بہت ہی پُرخار راہ سے بجز یہ منازل طے کرنا ہیں۔ جہاں قدم قدم پر بہت سی رُکاوٹوں کا سامنا کرنا ہے۔ وہ ششدر و حیران رہجاتا ہے جبکہ وہ دیکھتا ہے کہ اس جیسی دیگر ہستیاں بھی جو اس کی طرح کسی نہ کسی غرض کی ادائگی کے لیے، اسی راہ میں تگ و دو کر رہی ہیں لیکن بجائے غرض مشترک ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے ان میں سے اکثر دوسروں کے لیے سدِ راہ نظر آتی ہیں۔ وہ خود بھی بعض دفعہ اپنے آپ کو انہیں کی سی کشمکش میں مبتلا پاتا ہے اگر حس صحیح سے کام لیتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ باہمی کشمکش حقیقتاً اس کو تکمیل مقصد سے باز رکھنے والی ہے۔ بالآخر فطرتِ سلیمہ کی روشنی میں اسکو نظر آتا ہے کہ اسکو اور اس کے ابنائے جنس کو بغیر اس کے چارہ نہیں کہ جب تک وہ اس میدان میں تگ و دو کر رہے ہیں ان کو کسی ایسے ضابطہ کا پابند رہنا چاہیئے جو ان کی خدمات کو صحیح راستہ پر رکھنے کا ذمہ دار ہو اور جس کے ماتحت رہکر ہر ایک اپنے مقاصد کی تکمیل میں ساعی رہ سکے۔

اگر قدرت کے عطا کردہ حواس سے صحیح کام لے تو اس کو معلوم ہو گا کہ انسان ایک مقصد خاص کی تکمیل کی غرض سے ایک محدود زمانہ کے لیے اس عالم میں بھیجا گیا ہے۔ اس کے لیے اس کو اپنے زمانہ سے پہلی ہستیوں کے طرز عمل پر نظر ڈالنے کی فطرتاً ضرورت

محسوس ہوتی ہے اور وہ ان کے دستور العمل کا جویاں ہوتا ہے جن کے کارناموں سے اس کو یہ سبق ملتا ہے کہ بغیر اس خاص اصول کی پیروی کیے جنہیں اخلاف اسلاف کے لیے بطور یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ چارہ نہیں ہے۔

ہم سُنتے آئے ہیں کہ افکار انسانی کی یہ تمام گل تراشیاں، انسانی تجلیات کی بلند پروازیاں اور اس دنیا کی تمام بزم آرائیاں صرف ایک اساسی اصول پر کاربند رہنے کا نتیجہ ہیں جسے اصطلاح میں اصول تمدن کہتے ہیں۔ یہ خوش حال اور فارغ البال شہروں کی آبادیاں اور تہذیب جدید کی دلفریب گل کاریاں بھی اس تمدنی زندگی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہیں۔ یہ بحر و بر میں بے خطر سیاحت اور یہ کوہ و جبل کی بے ضرر مساحت صرف تمدن کی بدولت آسان ہو گئی ہے۔ اسی تمدن سے اقوام نے ترقی کی اوسہ مدارج عالیہ پر پہنچیں فتح و نصرت ہمرکاب ہوئی اور اقبال سے بہرہ مند ہوئیں اور جب کبھی اس سے منہ موڑا اقبال نے ساتھ چھوڑا۔ تنزل نے منہ دکھایا اور ادبار میں گرفتار ہوئیں اور بالآخر قعر مذلت میں جا گریں۔ یہی تمدن ہے جس نے معمولی اقوام کو قعر مذلت سے نکال کر اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچایا اور بیانگ دہل سائر کائنات پر ثابت کر دکھایا کہ میرا پیرو دنیا میں ہمیشہ سُرخ رو رہیگا اور مجھ سے برگشتہ دائمی ذلت و مصیبت میں مبتلا کر دیا جائے گا۔

جب اس تمدن کے اسقدر اثرات ہیں تو فطرتاً ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ تمدن کے ان زرین اصول کو معلوم کرے اور حقیقت تمدن سے کماحقہ واقفیت پیدا کرے۔

لہذا ہم تمدن کے مالہ و ما علیہ سے بحث کرتے ہیں۔

تمدن عربی لفظ ہے جو لفظ مدینہ سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی شہر کے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں تمدن چند اشخاص کے یکجا ہو کر ایک شہر میں رہنے کو کہتے ہیں اور یہ اصطلاح تمام ان قوموں کی اظہار حالت کے لیے مستعمل ہوتی ہے جو بمقابلہ وحشی اور جنگلی لوگوں کے زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہیں۔ مثلاً اقوام یورپ بلحاظ چینیوں اور تاتاریوں کے زیادہ متمدن سمجھی جاتی ہیں۔ امریکہ کے اصلی باشندے اور اہل آسٹریلیا سب سے کم متمدن خیال کئے جاتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آخر الذکر بھی یکجا طور پر شہروں ہی میں آباد ہیں، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جو اول الذکر و آخر الذکر اقوام میں مابہ الامتیاز ہے؟

امثال متذکرہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمدن کی اصطلاح دو معنوں کے لیے مستعمل ہوتی ہے، اول مفہوم تو اس کا یہ ہے کہ اس سے بالعموم انسانی ترقی مراد لیجاتی ہے مثلاً جب ہم کسی قوم کسی شہر و ملک کو زیادہ ترقی یافتہ یا انسانیت میں زیادہ مکمل اور سر برآوردہ دیکھتے ہیں یا ہم ان کو زیادہ خوش و خرم، لطیف و نظیف زیرک و دانا اور زیادہ متحد پاتے ہیں تو ان کو متمدن کہتے ہیں اور یہ تمدن کا عام مفہوم ہے۔

اس کے علاوہ ہم تمدن کو اک خاص مفہوم میں استعمال کرتے ہیں اور اس حالت میں اس سے اک خاص قطع کی ترقی مراد لیجاتی ہے۔ جیسے کہ جنگلی اور وحشی

جرگوں کے مقابلہ میں دولتمند اور ترقی یافتہ اقوام متمدن سمجھی جاتی ہیں اور یہ تمدن کا دوسرا مفہوم ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا تمدن بحیثیت مجموعی کوئی اچھی چیز ہے یا بری؟ یا یہ کہ اس کے محاسن اس کے معائب پر غالب ہیں، یا نہیں؟ اس کا جواب انسانی تجارب و تواریخ کے مشاہدوں کی بنا پر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ تمدن بذاتِ خود نہ صرف اک بڑی خوبی ہی ہے بلکہ بہت سی خوبیوں کا سبب بھی ہے اور دراصل کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس سے وہ ربط نہ رکھتی ہو، وحشیانہ زندگی کی خواہ کچھ ہی خصوصیات کیوں نہ ہوں لیکن وہ محاسن تمدن کو کبھی نہیں پہونچ سکتیں، وہ صفات جن کو سوسائٹی اپنے جامۂ وحشت کو اتار کر اصول قدیمہ کو اصول جدیدہ سے مبدل کر کے اختیار کرتی ہے انہیں سے تمدن ترکیب پاتا ہے، اک وحشی گروہ میں چند انفرادی ہستیاں یا چند اشخاص پراگندہ صورت میں آباد ہوتے ہیں اور غیر متمدن کہلائے جاتے ہیں لیکن ان کے مقابل میں اک گنجان آبادی جو مقررہ مسکنوں میں بود و باش رکھتی ہے اور ایک کثیر تعداد جماعت کے ساتھ قصبات اور شہروں میں آباد ہے اور متمدن کہلائی جاتی ہے۔ وحشیانہ زندگی میں تجارت زراعت اور صنعت و حرفت یا تو سرے سے ہوتے ہی نہیں اگر برائے نام کہیں پائے بھی جاتے ہیں تو وہ اسقدر بے اصول ہوتے ہیں کہ ان کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے لیکن اس کے مقابل میں ایک متمدن ملک زراعت تجارت اور صنعت و حرفت سے مالامال ہوتا ہے، وہاں کا ہر اک مشغلہ کسی نہ کسی اصول کے

ماتحت ہوتا ہے اور وہاں کا ہر کام ترقی کی شاہراہ پر انجام پاتا ہے، وحشی لوگوں میں ہر شخص انفرادی حیثیت سے صرف اپنی ذات کا فائدہ مدِ نظر اور ملحوظ خاطر رکھکر محنت و مشقت کرتا ہے اور غیر متمدن کہلائے جانیکا مستحق ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب ہم دوسری طرف بنی آدم کی اک جماعت کثیرہ کو کسی اک غرض مشترک کے واسطے مصروف کار یا باہمی معاشرت میں اک دوسرے سے متحد خوش و خرم شاداں و فرحاں دیکھتے ہیں تو اس کو متمدن کہتے ہیں۔ وحشیانہ زندگی میں کسی قانون نظم و نسق اور دادرسی کا یا تو وجود ہی نہیں ہوتا یا اگر کہیں پایا بھی جاتا ہے تو صرف برائے نام اور وہ صرف اس ضرورت سے کہ منفرد اشخاص اک دوسرے کی ایذا دہی اور آزار رسانی سے محفوظ رہیں، نہ تو سوسائٹی کی منضبطہ و متفقہ قوت باقاعدہ طور پر صرف میں آتی ہے اور نہ اتحاد اور جماعت کے فوائد سے کوئی واقف ہوتا ہے بلکہ ہر شخص واحد اپنی قوتِ بازو یا ذاتی چالاکی پر بھروسہ رکھتا ہے، برخلاف اس کے جس جماعت میں سوسائٹی کا نظم و نسق اس قدر کامل ہو جاتا ہے کہ اس جماعت کی متفقہ قوت سے ہر اک فرد کی جان و مال محفوظ رہے اور امن و امان قائم رہے ہے تو اس سوسائٹی کو ہم متمدن کہتے ہیں۔

اس موازنہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہم ترقی یافتہ انسان کو متمدن کہتے ہیں، اب ترقیاں بھی دو اقسام پر منقسم ہیں ایک ترقی وہ ہے جسے انسان اپنی ذاتی جد وجہد سے حاصل کرتا ہے۔ اور دوسری وہ جس کا حاصل کرنا ہر انسان کے پیش نظر اور مرکوز

خاطر رہتا ہے خواہ وہ اس کی عمر میں کسی وقت حاصل ہو، اب تمام اتحادات و انتظامات اور اختلافات جو زندگی کے ہر شعبہ میں کیئے جاتے ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو وحشیانہ حالت سے بالا اور بالا سے بالاتر اور پھر بالاترین مرتبوں پر پہنچادیں اور یہ پہلی قسم کی ترقی ہے لیکن دوسری قسم یا بالفاظ دیگر ترقی کی انتہائی منزل یہ ہے کہ انسان میں جو اوصاف موجود ہوں وہ سب حالت اعتدال پر آجائیں اور انسان اس قدر تزکیہ نفس کرے کہ اس کی روح صفات ملکوتی سے متصف ہو جائے یہی وہ ترقی ہے جو اصل ترقی ہے اور یہی ترقی یافتہ انسان اصل معنوں میں متمدن کہلائے جانے کا مستحق ہے لیکن جدید مغربی تمدن کی غایت صرف اس عالم کون و فساد میں انسانی قوتوں کا اس قدر ترقی کرنا ہے کہ عالم اور ما فی العالم اس کا مسخر ہو جائے اس نے ترقیات روحانی کو جو اصل ترقی ہیں بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔

انسان کا نصب العین مدارج ترقی کو طے کرنا اور اصل ترقی کے ملاء اعلیٰ پر پہنچنا ہے انسان کو فطرت سے بہت کچھ عطا فرمایا گیا ہے لیکن ان صفات فطرت میں تصرفات کرنا اور غور و خوض کر کے اپنے لیے سامان ترقی فراہم کرنا متمدن انسان کا کام ہے لہذا انسان کی ذہانت اور ذکاوت سبب ہے اور تمدن اس کا نتیجہ۔ انسان کی سعی بلیغ اور کوشش لامتناہی علت ہے۔ اور تمدن اس کا معلول۔ تمدن کا سب سے بڑا ثمرہ یہ ہے کہ قوت و اقتدار منفرد اشخاص اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر جمہور کے ہاتھوں میں پہنچ جائے اور روز بروز جماعت کا زور بڑھتا

اور اشخاص کا زور گھٹتا ہے۔ دوسرے وہ متفرق افراد کا ایک مجموعہ تیار کرے اور اس مجموعہ کو متحد کر کے اسے با اثر بنائے۔

اگر ایک وحشی شخص کے حالات زندگی پر نظر کیجائے۔ تو معلوم ہوگا کہ اس کو جسمانی قوت بھی حاصل ہوتی ہے اس میں دلیری اور جوانمردی بھی پائی جاتی ہے ہمت و جرات بھی موجود ہوتی ہے۔ لیکن باوجود ان تمام محاسن کے اس میں کوئی ایسی نمایاں کمی اور خامی پائی جاتی ہے جس کے سبب سے کل وحشی جرگے غریب و کمزور رہوتے ہیں وہ کمی اور خامی کیا ہے؟ وہ ہی کمی اور خامی ہے جس کے سبب سے شیر بھیڑیئے باوجود قدرت و قوت دلیری و ہمت انسان ضعیف البنیان کمزور و ناتواں پر غالب نہیں آسکتے۔ یعنی ان میں متحد ہو جانے کی قابلیت کا نہ ہونا اک ایسی کمی ہے جو ان وحشی جرگوں کو افلاس میں مبتلا رکھتی ہے اور اُن کی آیندہ ترقیات میں سدِ راہ ہوتی ہے۔

یہ صرف متمدن افراد کا کام ہے کہ وہ متحد ہو سکتے ہیں اک وحشی غیر متمدن نہ یہ کر سکتا ہے کہ کسی غرض مشترک کے واسطے وہ اپنے نفس پر سختی برداشت کرے اور حظ نفس کو چھوڑ دے نہ اس کے معاشرتی جذبات کبھی عارضی طور سے بھی اس کی نفسانی خواہشات پر غالب آسکتے ہیں نہ اس کے طبعی رجحانات اس کی انجام بینی کی وجہ سے کم و بیش ہو سکتے ہیں، عاقبت اندیشی وہ نہیں جانتا ذاتی بہبودی کے فوائد سے وہ بے خبر ہوتا ہے۔ لہذا ہر وہ بات جو دوسرے کی رضاجوئی کے لیے ضروری

ہوتی ہے اس کے دل سے دور رہتی ہے بجنسہ یہی حالت جو افراد کی ہوتی ہے اس جماعت کی بھی ہوتی ہے جس سے وہ تعلق رکھتے ہیں چونکہ جماعت نام ہے مجموعہ افراد کا اس لیے جسقدر کوئی گروہ وحشت سے قریب تر ہوتا ہے اسی قدر اشتراک عمل سے بعید تر ہوتا ہے۔

واقعات گذشتہ وحال پر اک سرسری نظر یہ ثابت کر دیتی ہے کہ غیر متمدن اقوام کبھی متمدن اقوام سے قدرت جنگ وجدل میں کامیاب نہیں ہوئیں اُنھوں نے ہمیشہ متمدن اقوام کے مقابلہ میں شکستیں کھائیں ہزیمتیں اُٹھائیں اور بالآخر متمدن اقوام نے فتح ونصرت کا جھنڈا بلند کیا اور بڑی بڑی سلطنتوں پر مدبرانہ حکومت کی، اقوام عالم کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب دو ملکوں یا دو قوموں میں باہم مقابلہ یا مجادلہ ہوتا ہے تو فتح وکامیابی کا سہرا اسی کے سر رہتا ہے جو بلحاظ تمدن فائق ہوتا ہے۔ مسائل بین الاقوام تعداد افراد سے طے نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ ان افراد کی ذاتی قابلیت ان کے متحد ہو جانے اور غرض مشترکہ پر ذاتی خواہشات کو فدا کر دینے کی قابلیت اور صلاحیت سے تصفیہ پاتے ہیں۔ یہ اک ایسا اصول ہے جس کا ہر شخص قائل ہے۔

ممالک غیر کو چھوڑ کر خود ہندوستان ہی کے صفحات تاریخ اس پر شاہد ہیں یہاں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا تھوڑے ہی سے غور کے بعد ان اصول کو بہمہ صفت اس پر منطبق ہوتا ہوا پا سکتا ہے وہ برائے العین مشاہدہ کر لیتا ہے کہ ہندوستان

کی عناں سلطنت جو ہمیشہ سے اقوام غیر کے ہاتھوں میں رہی ہے اس کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دیسی ریاستیں جو ابھی مردانگی شجاعت اور دلیری وجوانمردی میں زبان زد روزگار رہی ہیں جہاں کا اک اک سورما بڑے بڑے قدآور پہلوانوں کو یکہ وتنہا زیر کر دیتا ہے اور اک اک شخص دس دس کے لیے کافی ہوتا ہے جہاں غیرت ومحبت اس درجہ تھی کہ مفتوح ہونے سے جل کر فنا ہو جانا بہتر خیال کیا جاتا تھا وہاں جب اس سے زیادہ متمدن اور متحد ہو جانے والی قوم سے مقابلہ ہوا تو بالآخر یہ سب خوبیاں رکھی رہ گئیں اور آخر کار اس نے سب کو یکے بعد دیگرے سرنگوں کر دیا اور سب کی ہستی اس طرح فنا ہو گئی کہ اسلاف اخلاف کے لیے محض افسانہ ہو کر رہ گئے۔

یہاں تک تمدن کے حُسن قبح سے بحث کر کے ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تاریخ تمدن کی بابت علمائے زمانہ کیا رائے رکھتے ہیں، نوع انسان کی تاریخ لکھنے والے محققین ہیں جہاں اس کی ابتدائی آفرینش کے مسئلہ پر بجد قیل وقال ہے وہاں یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے کہ پیدائش انسان کس صورت اور ترکیب سے ہوئی یعنی کون سے قوائے عقلی، دماغی سے انسان مرکب ومرتب ہو کر دنیا میں آیا؟ انسانی جماعتیں جو اب متمدن نظر آتی ہیں ان کے تمدن کی تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے اور یہ وحشی اقوام جو آج غیر مہذب اور غیر متمدن کہلائی جاتی ہیں کیا ہمیشہ سے ایسی ہی ہیں یا کبھی اس سے زیادہ بہتر حالت میں تھیں اور اب گردش زمانہ سے ایسی غیر متمدن ہو گئی ہیں

یا یہ ہنوز اپنی فطرت پر ہیں؟ بالفاظ دیگر زمانہ تمدن و تہذیب مقدم ہے یا زمانہ وحشت وجہالت؟ اس مسئلہ پر دو فریق جداگانہ رائے رکھتے ہیں۔

انسان کی ابتدائے آفرینش کے بارے میں قدما کی رائے کو نظرانداز کرکے اُنیسویں صدی کے یورپ میں ڈارون نے جو نظریہ قایم کیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان ایک ترقی یافتہ جانور ہے۔ اس نظریہ کو نظریہ ارتقائیہ (ایوولیوشن تھیوری کہتے ہیں) ڈارون اور ہکسلے اس نظریہ کے قائل ہیں اگرچہ ہنوز اس کے دلائل تکمیل کو نہیں پہونچے ہیں اور سلسلہ استدلال کی بہت سی کڑیاں علم انسان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے ثبوت مزید کی محتاج ہیں۔ لیکن مدعیان کا یہ دعویٰ ہے کہ جس قدر سائنس میں ترقی ہوگی اور علم انسانی ترقی کرے گا اسی قدر وہ کڑیاں بھی ثبوت مزید کے دستیاب ہوجانے سے مضبوط و مستحکم ہوتی جائیں گی۔ سردست جس قدر دلائل پیش کئے گئے ہیں ان کی آب و تاب نے اہل نظر کی آنکھیں خیرہ کردی ہیں اور عام طور پر یہی رائے مقبول ہورہی ہے اور نہ صرف ہدایت انسان بلکہ تمدن کے نشو و نما کے بارے میں بھی ترقی اور روز افزوں ترقی کا ہر شخص قائل ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ انسان کے تمدن کی ابتدا کب ہوئی؟ اس بارے میں بھی دو مذہب ہیں اور دونوں متضاد ہیں۔ ایک گروہ اس کا حامی ہے کہ انسان کی ابتدائی حالت وحشت وجہالت کی تھی وہ براہین و دلائل سے ثابت کرتا ہے

کہ مرورِ ایام سے انسان نے بتدریج مدارج تمدن طے کیے ہیں اور اسلاف سے اخلاف زیادہ متمدن ہوتے چلے آئے ہیں۔ لیکن اک دوسرا گروہ محققین کا یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان اپنی بالکل ابتدائی حالت میں ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہے اگرچہ اس کو علوم حکمیہ اور علوم نفسیہ کا علم نہ ہو لیکن اس میں قوائے ذہنی اور عقلی کسی طرح بھی کمتر درجہ کے نہ تھے اس فریق کے اک بڑے حامی

ڈیوک آف ارگائل کی رائے یہ ہے کہ "انسان اپنے اعلیٰ درجہ تمدن اور شائستگی کی حالت میں بھی نہایت پستی اور تنزل میں پہنچنے کی استعداد رکھتا ہے، اس کا علم زائل ہو سکتا ہے اور اس کا مذہب چھوٹ سکتا ہے" بہرحال محققین آخرالذکر اس بات کے حامی ہیں کہ وحشی جرگوں میں از خود ترقی کی جانب مائل ہونے کی کوئی خاص قوت نہیں ہوتی اور نہ اس امر کا کوئی خاص بین ثبوت ملتا ہے کہ اُنہوں نے کبھی از خود ترقی کی ہو بلکہ بعض اقوام کی یکساں حالت پر غور کرتے ہوئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں ترقی کا مادہ سرے سے موجود ہی نہیں، جہاں وحشی اقوام آباد ہیں وہاں آثار قدیمہ کے محققین نے بیحد کد و کاوش کے باوجود بھی کوئی ثبوت گذشتہ تمدن کا نہیں پایا، یعنی طبقات زمین سے کوئی علامت تمدن قدیم کی نمایاں نہیں ہوئی گویا اس گروہ کے نزدیک زمانہ ترقی کی جانب مائل نہیں ہے۔

یہ مسئلہ اکثر معرض بحث میں رہا ہے اور ہر دو فریق اپنے دلائل سے ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر انسانی حالت کو بنظر غور

وامعان مطالعہ کیا جائے تو اس امر کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ اک کمزور مخلوق برہنہ جسم نازک بدن اور ضعیف الاعضا جس کی حفاظت جسمانی کے لیے نہ کوئی ہتیار ہے نہ کوئی یار و مددگار اس زندگی کے جدال و قتال میں مبتلا کی گئی ہے وہ رفیع الشان کوہستان کو نظر اٹھا کر دیکھتی ہے اور ان کی عظمت اس کے دل میں وحشت پیدا کر دیتی ہے وہ سنسان بیابانوں عمیق غاروں اور وسیع بر و بحر کا مشاہدہ کرتی ہے شیروں اور ہیبتناک درندوں کی آوازیں سنتی ہے اور اس پر سخت ہیبت طاری ہو جاتی ہے، فلک نیلگوں، روشن ستارے، آفتاب و ماہتاب اس کی آنکھوں میں خیرگی پیدا کر دیتے ہیں اور یہ سب چیزیں اس کو محوِ حیرت بنا دینے کے لیے کافی ہیں علاوہ اس کے بھوک پیاس گرمی سردی روز پیدائش سے دشمن ازلی اس کے ساتھ ہیں یہ حالت اس وقت تھی جب نوع انسان نے کتم عدم سے اس عالم رنگ و بو میں اپنا پہلا قدم رکھا۔ لیکن اس کمزور مخلوق نے تمام حوادث طبعی کا مقابلہ کیا اور ان کو مغلوب و مقہور کر کے اپنا اس قدر مسخر کر لیا کہ وہ سنگلاخ پہاڑوں میں بآسانی سرنگ لگا لیتی ہے۔ بر و بحر میں برسوں کا راستہ دنوں میں طے کر لیتی ہے، آفتاب ماہتاب سب اس کے ادنیٰ خادم ہیں تو کیا اس علمی تدبر اور تفکر کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ انسان صرف ایک مادی جسم کا نام ہے۔ اور ہمیشہ سے یکساں حالت میں ہے؟ بلکہ اس مادی انسانی جسم کے غلاف میں ایک ایسا جوہر مخفی ہے جس کی وجہ سے انسان کو دیگر حیوانات سے امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے اور وہ

مابہ الامتیاز شے نہ تو نطق ہے جیسا کہ ارسطو کا قول ہے اور نہ محض دینداری جیسا کہ ایک فرانسیسی فلسفی کا خیال ہے بلکہ دراصل وہ عقلی اور اخلاقی ترقی کرنے کی بیش بہا استعداد اور قابلیت ہے جس کی کوئی حد و غایت نہیں مقرر کیجا سکتی۔ حیوان ایک خاص اور مقررہ وقت تک ترقی کرسکتا ہے، لیکن انسان کے لیے کوئی حد نہیں ہے اس دعوی کی دلیل میں دو مشہور مغربی فلاسفروں کی رائیں قابل لحاظ ہیں، ایک فرانسیسی فلاسفر لاروس (Larousse) نے دائرۃ المعارف میں انسانی ترقی کی نسبت لکھا ہے کہ ترقی انسانی کے لیے کوئی خاص حد قرار دینا ایک ایسی حرکت ہی جو معیوب خیال کیجا سکتی ہے" میسو رنیاں (Renan) اپنی کتاب تاریخ الادیان میں لکھتا ہے کہ میں نے انسان کی حالت کو بنظر غائر مطالعہ کیا ہے بعض اوقات انسان اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کرکے اس امر کی سعی بلیغ کرتا ہے کہ اس کو وہ سبب معلوم ہوجائے جس کی وجہ سے اس کو غیر محدود اختیار اور نامتناہی اقتدار حاصل ہے، نیز یہ کہ وہ اس تمام مادی عالم پر مسلط ہوجائے"۔ اس سے یہ امر بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ انسان اپنے جوہر کی برتری اور گراں مائگی کے لحاظ سے ان تمام مادی چیزوں میں ممتاز ہے جن کو قدرت نے مجرد القوی پیدا کیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ انسان کبھی یکساں حالت میں نہیں رہ سکتا بلکہ یوماً فیوماً ترقی کے میدان طے کرتا چلا جاتا ہے، لیکن جس طرح انسان میں فضائل وکمالات کی طرف غیر متناہی درجات تک ترقی کرنے کی قابلیت ودیعت کی گئی

ہے اسی طرح رذائل کے نامحدود درجات کی طرف تنزل کرنے کی استعداد بھی اس میں رکھی گئی ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ کے یہی معنی ہیں انسان نہ تو کوئی آسمانی فرشتہ ہے نہ وہ حیوان لایعقل ہے کہ زندگی کے تاثرات اور اس کے آلام کا احساس اس کے دل میں نہ ہو یا ہو تو کمزور ہو بلکہ وہ ان دونوں درجوں کے درمیان میں ہے" اگر وہ اپنے نفس کا کما حقہ احترام کرے تو فرشتوں سے بھی اعلیٰ ہو سکتا ہے اگر نفسانی فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کرنے لگے اور بشریت کے تسلط کا مطیع ہو جائے تو تنزل کے عمیق ترین قعر میں غرقاب ہو جاتا ہے ؎

آدمی زادہ طرفہ معجونیست　　　　از فرشتہ سرشتہ وز حیواں

گر کند میل ایں بود بہ ازیں　　　　ور کند میل آں شود بد زاں

تاریخ تمدن پر نظر ڈالتے ہوئے تمدن انسانی کی تقسیم چار بڑے بڑے عہدوں پر ہو سکتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان نے کس طرح مدارج ترقی طے کئے پہلا دور وہ ہے جس میں انسان دیگر حیوانات کے ساتھ خلط ملط رکھتا تھا اور انھیں سے گھلا ملا رہتا تھا اس کے گرد و پیش نہایت عظیم الجثہ جانور رہتے تھے جن کا اب صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ بعض مقامات پر اسفل ترین طبقات الارض میں ان کے ڈھانچے برآمد ہوتے ہیں اور وہ بھی شاذ اس وقت انسان کی حالت محض چارپایوں اور درندوں کی سی تھی اور غالباً اس کی زندگی اور ایک جانور کی زندگی

کوئی فرق نہ تھا اس کے کھانے کے واسطے جنگلی میوے اور کمزور جانور موجود تھے اور اس کی بود و باش کے لیے پہاڑوں کے غار اور درختوں کی سایہ دار شاخیں کافی تھیں۔

دور ثانی وہ ہوا جس میں اس نے اور دیگر پتھروں کے سڈول ہتھیار اور اوزار بنانا اور ان سے کام نکالنا شروع کیا یہ عہد حجریہ (Stoneage) کہلاتا ہے اس وقت اس کے کل کام یا تو خود اس کی قوت بازو سے نکلتے تھے یا پتھروں کے ذریعہ سے پتھر ہی اس کے آلات حرب وضرب تھے۔ پتھر ہی اس کے ظروف اکل و شرب تھے اور پتھروں ہی میں وہ رہتا تھا یہ عہد تمام اکناف عالم میں مشترک ہے۔

دور ثالث وہ ہوا جس میں برنجی اور مسی آلات اور اوزار بنائے گئے اس عہد مس و برنج یا (Copperage) کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس عہد کا پتہ زیادہ تر ایشیا اور یورپ کی قدیم قوموں میں ملتا ہے اور انھیں کے یہاں یہ عہد صدیوں تک قائم رہا لیکن یا ایشیا جنوبی افریقہ اور وسطی امریکہ میں عہد حجریہ کے بعد یہ عہد نہیں ہوا بلکہ دور چہارم جس کو آہنی عہد یا (Ironage) کہتے ہیں شروع ہو گیا۔ اس عہد میں آہنی آلات تمام سابقہ آلات و ظروف پر سبقت لے گئے لیکن اس عہد میں بھی آلات موجود رہے مگر فوقیت لوہے کو رہی اسی طرح دور چہارم اس سے زیادہ ترقی یافتہ انسانوں میں پایا گیا اور سلسلہ ترقی پکڑتا گیا۔

لیکن ان چار عہدوں کے علاوہ ایک اور صورت سے بھی ترقی کے مدارج بیان کیئے جاتے ہیں کہ پہلا وہ دور تھا جب انسان جنگل کا ایک شکاری تھا وہ مختلف درندوں اور پرندوں کو مار کر اپنی قوت لایموت مہیا کرتا تھا۔ پھر دوسرے دور میں اس نے ترقی کر کے ماہی گیری شروع کی۔ دریا سے مچھلیاں مارنے کے واسطے اس نے جال وغیرہ تیار کیے۔ پھر میوہ برداری پر اس نے اپنی توجہ مبذول کی اور فواکہات کے مزے سے اس کے کام و دہن آشنا ہوئے۔ اب اس حالت سے درختوں کی مختلف فصلوں کا علم ہوا اور تجربہ نے اس پر وہ نکات و رموز منکشف کر دیئے جن سے اس نے درختوں کا بونا اور کاشت کرنا سیکھا اس زراعت میں اس کو اس قدر فراغت نصیب ہوئی کہ مختلف فنون و حرفت و مشقت میں اس نے اپنا قدم رکھا اور سوشل خیالات اور پولٹیکل معاملات کا چرچا شروع ہو گیا۔ اس سلسلہ میں شخصی انتقام کی جگہ یہ خیال پیدا ہوا کہ ہر جرم اس لیے سزا کے قابل ہے کہ اس سے سوسائٹی کے امن عامہ میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح اک قبیلہ کی حکومت ایک شخص واحد کے ہاتھ سے نکل کر متعدد گھرانوں اور خاندانوں کا ایک مجموعہ بنا اور پھر دائرہ تمدن ترقی کرتے کرتے اس قدر بڑھا کہ ملکی اور قوموں کی حکومت کے لیے ریاست و بادشاہت معرض وجود میں آئی۔

تمدن اور مذہب۔ اگر تواریخ عالم کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بنی آدم کا تمدن متعدد حیثیتوں سے ان کے مذہب سے وابستہ ہے اقوام کے عروج و نزول

میں ان کا مذہب بہت کچھ دخیل ثابت ہوا ہے یہاں تک کہ زمانہ قدیم سے اب تک یہ امر زیر بحث ہے کہ ان میں سے کون سبب ہے اور کون مسبب؟ زمانہ گذشتہ کے محققین اور نیز اہل مذہب اس رائے پر پہنچے ہیں کہ تمدن سبب ہے اور مذہب اس کا نتیجہ، ان کی تالیفات و تصنیفات مذاہب کی نسبت طعن و تشنیع سے مملو نظر آتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی آنکھیں ان کی روشنیٔ طبع سے اس قدر خیرہ ہوگئی ہیں کہ مذاہب ان کے نزدیک دراصل کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ وہ مذاہب کو صفحہ ہستی سے محو ہو جانے کی دھمکی دے رہے ہیں، چنانچہ اس موقع پر ہم چند یورپین فلاسفروں کی رائے ان کی مشہور و معروف تصانیف سے اخذ کر کے اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

بینو نجمین کونستان (Benjamin constan) نے اپنی مشہور کتاب میں جس کا نام مذہب اور اس کا سرچشمہ اور اس کی شکلیں اور اس کی ترقی ہے ان امراض سے بحث کی ہے جنھوں نے باطل اعتقادات کی مدد سے انسانی گروہوں کے جسم کو کھلا ڈالا ہے۔ اور اس کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کا علاج شخصی آزادی ضمیر یا کانشینس کی آزادی، اعتقاد کی آزادی اور تمام ضروری آزادیوں کے بغیر ناممکن ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ "اس طریقہ سے مذاہب اپنے ہر قسم کے زنگ اور میل سے پاک و صاف ہو جائیں گے مگر ہم کو خیال نہیں کہ ایسا ہو سکے کیونکہ مذہبی اصول و قواعد میں سے کوئی قاعدہ بھی ایسا نہیں ہے جس کو زنگ نہ کھا چکا ہو اور چونکہ یہ اصول و قواعد منافی علم ہیں اس لیے یہ بالکل واضح ہے کہ تمام مذاہب

اور دین ضرور صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائیں گے" یہاں ایک مشہور فلسفی نے اپنی رائے کے مطابق تمام مذاہب کے لیے بغیر کسی استثنار کے یکقلم پیشین گوئی کردی ہے کہ ان کا زوال لازمی اور ضروری ہے آگے چل کر وہی لکھتا ہے کہ ہر ایک قاعدہ خواہ وہ موجودہ حالت میں کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہوگی جو آیندہ زمانہ میں ترقی کے لیے سدِ راہ ہوگی چونکہ وہ قاعدہ عرصہ کے بعد ایک ساکن شکل اختیار کرلے گا جس کا اتباع عقلِ انسانی کے لیے اپنے انکشافات میں جن کی روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے، ناممکن ہوگا۔ اور جب ایسا ہوگا تو اس منجمد قاعدہ کا مذہبی احترام دلوں سے مفقود ہو جائیگا اور ایسے اصول و قواعد کی تلاش ہوگی جو ان جدید ترقیات اور انکشافات کے منافی نہیں"

علامہ رینن - مذہب کی نسبت اک موقع پر لکھتا ہے کہ "مذہبی فضیلت اور بالخصوص اعلیٰ درجہ کی فضیلت جو اولیاء اللہ کے ساتھ مختص ہے یہ ہے کہ تمام سیاسی اور تمدنی زندگی کو خیر باد کہو اور تمام دنیوی کاروبار کو مثل ایک لغو اور باطل چیز کے ترک کردو، تاکہ تمہارے لیے یہ امر ممکن ہو کہ تم رنج و غم اور شکستہ دلی کے ساتھ جنت کے انتظار میں سو کھتے ہو اور اپنی تمام خصلتوں اور خواہشوں کو قتل کر ڈالو اور اپنے نفس کو مٹا دو"

غرض یہ ہی کہ فلاسفہ یورپ اور ماہرین علومِ مغربی یہ رائے رکھتے ہیں کہ انسان

کی ترقی کا انحصار علم کی ترقی اور اس کے نشو و نما پر ہے اور علم کی ترقی اس پر موقوف ہے کہ عقل کو اس کے قیود سے آزاد کر دیا جائے اور علمی مباحث کے لیے کسی قسم کی کوئی مزاحمت اور روک ٹوک باقی نہ رہے تاکہ اس مزاحمت سے وہ بدترین نتائج پیدا ہوں جو قدیم زمانوں میں علمی اور مذہبی گروہوں کے باہمی جدال و قتال سے پیدا ہوئے تھے ان کا اعتقاد یہ ہے کہ عقل و علم کی آزادی پر انسان کی مادی اور ادبی صلاح و فلاح منحصر ہے۔

علامہ لاروس (Larousse) کی ایک مقام پر اس طرح پر رقمطراز ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ ہم معقول چیزوں کا اعتقاد رکھیں تو اہل مذہب کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں، پھر وہ انسانی عقل کے مطیع کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو عدل و ظلم اور خیر و شر کے درمیان تمیز کرنے کا دعویٰ کرتی ہے اور جب وہ عقل و بصیرت کو اسقدر اندھا کر دیتے ہیں کہ کرامات اور خوارق عادات اس کو بالکل معمولی اور عادی امور معلوم ہونے لگتے ہیں اور عقل سفید و سیاہ اور بدی کو نیکی سمجھنے لگتی ہے تو مذہب کہتا ہے کہ اطاعت کرو۔ کس کی اطاعت کریں؟ آیا عقل کی اطاعت کریں؟ اپنے نیچرل فرائض کی؟ ذاتی احساسات کی؟ حقیقی قوانین فطرت کی جو انسان کے لیے مفید ہیں؟ ہرگز نہیں مگر تم اندھے بن کر اس کی اطاعت کرو۔ جو خدا کے نام سے حکم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ بادشاہ کے قتل کرنے یا باپ کے مار ڈالنے کا بھی حکم دے یا ایک قتل عام برپا کرنے پر آمادہ کرے کیونکہ تجھ میں

نہ روح ہے نہ ضمیر بلکہ تو خدا میں فنا ہو گیا ہے "۔

وہ اعتقادات و خیالات ہیں جنپر ہمارے عقلائے یورپ مذہب کے بارے میں فخر کرتے ہیں اور تمام ترقیات کو اپنے ذاتی عقول پر منحصر کرتے ہیں لیکن وہ اس زرین اصول سے بیخبر ہیں کہ الدین ھو العقل ولا دین لمن لا عقل لہٗ اس میں شک نہیں کہ عقل نوع انسانی کی بہترین خصوصیت ہے اور خدائے تعالیٰ کی افضل ترین نعمت جو انسان کو عطا کی گئی ہے۔ جس مقصد کے لیے یہ عظیم الشان نعمت عطا ہوئی ہو اگر اسی مقصد میں استعمال کی جائے اور اس کی صحت اور اعتدال قائم رکھنے کے لیے توجہ مبذول کی جائے تو اس سے حیرت انگیز نتائج ظاہر ہوتے ہیں چنانچہ اس عقل کی بنا پر جہاں عقلائے یورپ مذہب کے اس قدر مخالف ہیں وہاں وہ اس امر کا بھی اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ مذہبی احساس نفس انسانی میں ایک ایسا فطری اور خلقی احساس ہے جیسا کہ انسان کو غذا اور ہوا کی ضرورت کا احساس ہے۔ چنانچہ علامہ جلیلر (Jellinek) ایک جرمن فلاسفر اپنی کتاب تاریخ الاعتقاد میں لکھتا ہے کہ مذہب مثل اس احساس کے جس کا وہ نتیجہ ہے ہمیشہ رہنے والی چیز ہے مگر مذہبی علوم مثل دیگر علوم و فنون کے ہیں جو رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کرتے جاتے ہیں جسقدر کہ انسانی عقل ترقی کرتی ہے اور انسانی تعلق ہمیشہ حقوق اور علم قوانین کے درمیان موجود رہتا ہے۔

خود لاردس ہی مذہبی نظامات کی نسبت طعن کرنے کے لیے لکھتا ہے کہ "جو چیز انسان کو اپنے فرائض کی انجام دہی پر آمادہ کرتی ہے وہ مذہب نہیں ہے

بلکہ وہ عام خیال ہے اور قوتِ طبیعت اور نیز وہ احساسات ہیں جن کی نشو و نما سوسائٹی اور خاندان کے درمیان ہوتی ہے جس قدر کہ معلومات اور تمدن کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اسی قدر یہ عام خیال بھی اپنی موجودہ سطح سے اونچا ہوتا جاتا ہے اگر مذہب کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایسے عمدہ خیالات کا مجموعہ ہے جو تمام انسانی افراد کو ایک ایسی سوسائٹی میں مربوط کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کے افراد مادی فوائد سے متمتع اور روشن خیال ہوں۔ تو بیشک اس صورت میں یہ قول صحیح ہوگا کہ مذہب نوع انسانی کے لئے ایک ضروری اور ابدی چیز ہے۔

یہ امر کہ عقل انسانی خواہ ترقی کے کسی اعلیٰ ترین درجہ پر کیوں نہ پہنچ جائے مگر وہ بغیر مذہب کے زندہ نہیں رہ سکتی اس کی واضح دلیل ہے کہ علمائے یورپ نے بھی باوجود مخالفت مذہب بالآخر مجبور ہو کر ایک مذہب تصنیف کیا جس کا نام مذہب طبعی رکھا۔ اس کے علاوہ ہم روزانہ برائے العین مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض ایسے لوگ موجود ہیں جو جسمانی صحت سے متمتع ہیں دولت و ثروت میں قارونِ ثانی ہیں۔ اور انھوں نے مختلف علوم و فنون کی زبردست تعلیم حاصل کی ہے لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ہر وقت ان کو ایک قسم کی اندرونی گھبراہٹ اور دلی بے اطمینانی اور بےچینی سخت محسوس ہوتی ہے جو ان کی تمام راحتوں اور لذتوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی ہے ان کو اپنے دل میں ایک ایسا تکدر و ملال محسوس ہوتا ہے جس کا کوئی سبب ان کو معلوم نہیں ہوتا اور جو صرف اسی وقت زائل ہو جاتا ہے جب مذہب

کی شراب طہور کا ایک تسکین بخش گلاس ان کو مل جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اس پر اسقدر فریفتہ اور دلدادہ ہو جاتے ہیں کہ بعض مرتبہ تمام دنیوی جاہ و جلال اس کے سامنے ان کو ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے چنانچہ ڈاکٹر گل امریکہ کے مشہور پروفیسر جو حال ہی میں ہندوستان بغرض سیاحت تشریف لائے تھے اپنے لیکچر میں فرماتے ہیں۔ کہ "امریکہ میں باوجود اس قدر تمول اب جس چیز کی ہر دل میں جستجو ہے وہ اخلاق کیرکٹر یا مذہب ہے" ان کی رائے ہے کہ دنیا میں کوئی شخص خواہ جسمانی دماغی یا مالی کتنی ہی ترقیاں کیوں نہ لے بغیر کیرکٹر یا مذہب کے ہرگز قابل قدر و منزلت نہیں ہو سکتا۔ اور ایک لامذہب سوسائٹی کے لیے سم قاتل ہوتا ہے جس سے تمدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

مذہبی ضروریات کا اندازہ کرتے ہوئے اب ہم موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یعنی انسان کے مدنی الطبع ہونے سے بحث کرتے ہیں یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ انسان فطرۃً مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی انسانوں کی ایک جماعت کثیر کا راحت کیساتھ عمر طبعی تک پہونچنے اور آیندہ نسلوں کو راحت و آرام سے عمر طبعی تک پہونچانے کی غرض سے باہم مل کر بود و باش اختیار کرنا انسانی فطرت ہے۔

جب راحت کے ساتھ عمر طبعی تک پہونچنے اور آیندہ نسلوں کو عمر طبعی تک براحت آسایش پہونچانے کے لیے ایک کثیر جماعت باہم مل کر رہتی ہے تب اس میں تعامل اور تعاون شروع ہوتا ہے یعنی تمام وہ امور جو شخصی اہلی اور نوعی زیست کے باقی

رہنے اور بہتر ہونے کے لیئے ضروری ہیں ان کو وہ بہت سے اشخاص آپس میں علیٰ قدر مراتب بانٹ لیتے ہیں ہر شخص کے تمام ان کاموں میں سے جو وہ روزانہ انجام دیتا ہے بعض ایسے ہوتے ہیں جو وہ صرف اپنی ذات کے لیے کرتا ہے اور زیادہ وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے فائدہ کے لیے ہوتے ہیں -

تصاحب و تعامل سے جو مطلق آزادی کسی جزیرے کے ایک تنہا باشندے کو ہوسکتی ہی اس میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوجاتا ہے، تنہائی میں وہ اپنے فعل کا خود مختار تھا لیکن اجتماعی زندگی میں یہ ناممکن ہوجاتا ہے، یہاں دوسروں کا خیال غالب ہوتا ہے۔ تنہائی میں صرف اپنی زیست راحت سے بسر کرنے کی فکر ہوتی ہے اجتماعی زندگی میں نوع انسان کی زیست کی فکر اس پر اور زیادہ ہوجاتی ہے -

اب جبکہ انسان کا بالطبع مدنی الطبع ہونا ثابت ہوگیا تو ضرورت اس امر کی ہوئی کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا برتاؤ ایک دوسرے کے ساتھ کن اصول پر ہونا چاہیئے آیا اس کو اس کی ذاتی خواہشات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دینا چاہیئے، یا اپنی ضروریات زندگی کو مقدم سمجھنا ضروری ہے جب ہر فرد کے انفرادی افعال جو زیست میں دخل رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے کیئے جائیں کہ وہ فاعل کی زیست کو راحت و آرام کے ساتھ عمر طبعی تک پہونچا دیں۔ تب وہ نافع للذات کہلاتے ہیں اور جب وہ اس اعتبار سے کیئے جائیں کہ اُن سے اپنی ذات کے برخلاف دوسروں کو فائدہ ہو تب وہ نافع اللغیر کہلاتے ہیں بالفاظ دیگر اپنے ذاتی مقاصد کی طلب کا نام **انانیت**

ہے اور دوسروں کے مقاصد کی طلب کو اخوانیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

انسان میں راحت پسند اور صحبت پسند ہونا دونوں امر طبعی ہیں اور وہی تمام ان افعال کی بنا رہیں جن کا تعلق زیست سے ہے اس لیے تمام افعال خواہ وہ نافع للذات ہوں یا نافع للغیر باہم ایسے وابستہ ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

تصاحب وتعامل کی حالت میں جس قدر نافع للذات افعال واجب ہیں اسی قدر نافع للغیر بھی واجب ہیں، اب وہ اشخاص جو صرف نافع للذات افعال کرتے ہیں اور نافع للغیر کو چھوڑ دیتے ہیں وہ اصول تصاحب وتعامل کو درہم برہم کر کے قوم کی تباہی کا سبب ہوتے ہیں اور چونکہ خود بھی قوم کے ایک فرد ہیں اس لیے ہلاک ہو جاتے ہیں اسی طرح وہ اشخاص جو اپنا وقت عزیز زیادہ تر افعال نافع للغیر میں گذارتے ہیں اور ضروری نافع للذات افعال کی پروا نہیں کرتے وہ بھی بالآخر فنا ہو جاتے ہیں"۔

ہربرٹ اسپنسر نے اس موضوع پر کافی توجہ کی ہے اور انانیت واخوانیت دونوں میں توافق وتطبیق کی کوشش کی ہے۔ اس نے دکھایا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی میں بھی اگر افراد پسندی سے کام لیا جائے تو خود اس کی بربادی لازم آتی ہے اگر ہر شخص اپنے ہی اغراض کا طالب ہو تو کسی ایک فرد کی بھی غرض حاصل نہ ہو گی اس لیے کہ ہر شخص اکثر حالات میں دوسروں کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ اور تمام افعال اپنی زیست کے لیے انجام نہیں دے سکتا دوسری طرف اگر ہر شخص اپنی ذات کو تمام تر صرف دوسروں ہی کے لیے وقف کر دے تو یہ خود ان کے لیے

مضر ثابت ہوگا اس لیے کہ اگر ہر شخص خود اپنی خبر گیری سے بے پرواہی برتے تو وہ اس اہلیت اور قابلیت کو نقصان عظیم پہونچائیگا جو اس میں دوسروں کی اعانت کی ہے اور اصل فائدہ مفقود ہو جائے گا، اس بحث کو فلاسفر مذکور نے نہایت دلچسپ طریقہ پر بیان کیا ہے اور بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ ہمارا مقصد نہ تو خالص انانیت ہونا چاہیے اور نہ محض اخوانیت بلکہ ان دونوں کی تطبیق و توفیق۔

لیکن یہاں اگر ذرا نظر غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ فی الحقیقت انانیت اور اخوانیت میں اس سے بھی کم منافات اور تباین ہے جیسا کہ ہربرٹ اسپنسر کو نظر آتا ہے اس لیے کہ نفس کی حقیقی تکمیل صرف مقاصد اجتماعیہ ہی کی تکمیل سے ممکن ہے، جناب ہیگل کا مقولہ ہے کہ "ہم اپنی تکمیل اپنی قربانی ہی سے کر سکتے ہیں"۔ اور اس طریقہ سے ممکن ہے ہم کو اپنی ذات کا تحقق ہوتا جاتا ہے، اسی حد تک کلی نقطہ نظر سے قریب ہوتے جاتے ہیں یعنی وہ نقطہ نظر جس سے ہماری نگاہ میں اپنی شخصی بھلائی کسی دوسرے کی بھلائی سے زیادہ اہم نہیں رہ جاتی، اس میں شک نہیں کہ اپنی انفرادی ترقی کا خیال دوسروں کی ترقی کے مقابلہ میں ہمارے لیے ہمیشہ لازمی ہے کیونکہ اپنی ذاتی ضرورتوں کو ہر شخص خود ہی خوب سمجھ سکتا ہے، اور اپنی ذاتی ترقی و تکمیل کے وسائل خود ہی خوب جانتا ہے لیکن اپنی ذات کی فلاح اندیشی جماعت کی فلاح اندیشی کے نقطہ نظر پر مبنی ہو تو اس کو صحیح معنوں میں انانیت نہیں کہا جا سکتا، اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک فرد کی تکمیل ہے، لیکن جماعت کے لیے جس میں ذاتی خواہشوں

کو اجتماعی منافع کے لیے قربان کر دیا جاتا ہے اور ذاتی ترقی کا اصلی مقصد اجتماعی ترقی ہوتی ہے۔ جب یہ مسلم ہو جائے تو انانیت اور اخوانیت میں کوئی تعارض باقی نہیں رہتا کیونکہ اس صورت میں ہم نہ صرف اپنی بھلائی چاہتے ہیں اور نہ محض دوسروں کی بلکہ دونوں کی اور یہ سمجھ کر کہ دونوں ایک ہی کل کے جزو ہیں۔

انفرادی ہستی بحیثیت ایک فرد ہونے کے بالکل نیست ہے چنانچہ ارسطو نے انسان کی تعریف یہ کی ہے کہ "وہ ایک سیاسی حیوان ہے" اور اخلاقیات پر جب تک اس کو سیاسیات یعنی علم جماعت یا سوسائٹی کا ایک جزو نہ قرار دیا جائے تسلی بخش بحث نہیں ہو سکتی کیونکہ جس قدر بھی فرائض و محاسن اخلاق ہیں وہ ہر قدم پر ہمارے ایک دوسرے کے ساتھ باہمی روابط پر موقوف ہیں اگرچہ دور جدید انفرادی آزادی اور شخصی حریت کا حامی نظر آتا ہے، لیکن حکمائے قدیم کے خیالات اس کے بالکل برعکس معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ **افلاطون** کی مشہور کتاب **جمہوریت** ہے جس میں وہ انسان کی اجتماعی فطرت سے اس درجہ متاثر تھا اور اجتماعی پہلو سے حیات انسانی کے مطالعہ کو اسقدر ضروری جانتا تھا کہ انفرادی محاسن اور شخصی آزادی کی تحقیق کی بجائے پہلے اس نے اچھی حکومت کے ممیزات معلوم کرنے کی کوشش کی ان پر کافی روشنی ڈالنے کے بعد اس کے نزدیک عمدہ شخص واحد کا امتیاز نہایت آسان تھا، یہی وجہ ہے کہ اخلاقیات میں افلاطون کی سب سے بڑی تصنیف اس کی کتاب جمہوریت ہے۔ جس میں اس نے ایک نصب العین حکومت کا خاکہ کھینچا ہے، یونانیوں

کی عام رائج تقسیم کی رو سے اس حکومت کے وجود کے لیے افلاطون کے نزدیک چار بڑے فضائل کا کسی شخص واحد میں پایا جانا ضروری تھا۔ یعنی حکمت۔ شجاعت عفت اور عدالت ان فضائل کی جو اہمیت حکومت کے لیے ہے اس سے وہ انفرادی زندگی میں ان کی اہمیت کا نتیجہ نکالتا تھا۔

نہ صرف افلاطون بلکہ ارسطو کو بھی انسان کے مدنی الطبع ہونے کا کچھ کم دعویٰ نہ تھا۔ اس نے اخلاقیات پر جو بلند پایہ کتاب لکھی ہے اس کا حصہ اولین یہی ہے کہ کہ اخلاقیات سیاسیات کا ایک جزو ہے اس کی تصنیف ان تمام فضائل سے جو کسی حکومت میں عمدہ شہروں کے لیے ضروری ہیں اور جنکو وہ یونان میں موجود پاتا تھا۔ لہذا معلوم ہوا کہ یونانیوں کا بہترین علم اخلاق ایک ایسی حکومت کے تخیل پر مبنی ہے جس کے اندر رہ کر افراد کو اپنی زندگی کی تکمیل کرنا چاہیے۔ اور فرقہ رواقیہ یا (Stoic philosophy) کا مسلک صرف اس وقت وجود میں آیا جب کہ یونانی حکومت کا زمانہ گذر چکا تھا، اور ان پر روم کے باشندے فاتحانہ حکومت کر رہے تھے۔

رواقیت کی رو سے نکوکار انسان جس کو وہ حکیم کے نام سے موسوم کرتے تھے کسی خاص رشتہ اجتماعی کا پابند نہیں ہوتا تھا بلکہ خود اپنی مستقل اور آزاد زندگی رکھتا تھا لیکن باوجود اس کے وہ اس کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک اعلیٰ اخلاقی عمدہ آدمی شہری ہوتا ہے، ان کی تعلیمات، جسمانی، روحانی اور اخلاقی

بلند اور اعلیٰ تھیں لیکن اصول تمدن سے اجتماعی روابط کی ان میں بہت کمی پائی جاتی تھی جس نے ان کو زمانہ کی نظروں میں تقریباً بے معنی اور خارج از انسانیت بنا دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تعلیمات انفرادی آزادی کے قریب لفاظیوں کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے یہاں آکر ہم کو اس کا بھی انکشاف ہو جاتا ہے کہ مسیحیت میں رہبانیت کس حد تک جائز ہے۔ اس رواقیت کے اصول، پر مسیحیت نے بھی یہی راہ اختیار کی یعنی عیسائی مذہب کی بنیاد بھی بلا قید ملک و ملت رواقیت ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افراد کی مستقل بالذات اور مستغنی عن الاجتماع حیات کی قائل نظر آتی ہے اس کا مسلک یہ ہے کہ "ہر شخص کو خود اپنی نجات کی راہ نکالنا چاہیئے اور زندگی کے اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لیے والدین، اعزہ و اقارب اور دوست احباب تک کو چھوڑ دینا چاہیئے، چنانچہ بڑے بڑے خدا پرست جنگل بیابان یا پہاڑ کی کھوہ میں عبادت الٰہی میں مصروف رہنا پسند کرتے رہتے ہیں اور اس متمدن زندگی پر اس رہبانیت کی زندگی کو بہمہ وجوہ ترجیح دیتے ہیں لیکن اگر اصول مسیحیت اور اس زمانہ کے حالات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت کو اپنے زمانہ میں چونکہ ایک بالکل نئے حالات کی دنیا سے مقابلہ کرنا تھا اس لیے لازمی طور پر اس کو شروع میں رہبانیت پر کسی قدر زیادہ زور دینا پڑا لیکن جب اس نے کچھ عرصہ بعد ایک بڑی دنیا کو فتح کر لیا تو اس کا اجتماعی رُخ سامنے آنے لگا۔ اور بالآخر وہ اس امر پر زور دینے میں بھی کسی دوسرے مذہب

سے پیچھے نہیں رہا کہ

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

کہ در آفرینش زیک جوہر اند

اور اسی کے کمال کے لیے خدا اور بندوں دونوں کے ساتھ اتحاد و اتصال ضروری ہوگیا۔ چنانچہ عیسائی دنیا میں بھی اب یہی رُخ زیادہ اہم و ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد جب ہم مذاہب اسلام کی طرف نظر کرتے ہیں تو صاف الفاظ میں ہم کو نظر آتا ہے کہ لا رھبانیۃ فی الاسلام یعنی اسلام میں غیر متمدن زندگی کسی طرح جائز ہی نہیں ہے۔ اصولِ شرع یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ہم کسی طرح بھی غیر متمدن زندگی بسر کر کے عاقبت میں نجات کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ رہبانیت کی زندگی کو سرے سے ہی ناجائز بتاتے ہیں، اور اگر ذرا بھی غور و خوض سے کام لیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ دراصل انسان ایک دوسرے کا دنیوی ضروریات میں اس قدر محتاج بنایا گیا ہے کہ وہ رہبانیت کی زندگی براحت بسر نہیں کر سکتا یہ مسئلہ اس وقت بالکل صاف ہو جاتا ہے جب یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی خاص جگہ کے تمام باشندے رہبانیت کی زندگی بسر کرنے لگیں۔ قیاس اسکو تسلیم نہیں کر سکتا کہ ان کی مایحتاج اشیاء کی فراہمی کس صورت سے ممکن ہے جب ایک اصول چند افراد کے لیے نہ صرف مشکل بلکہ محال محض ہو تو اقوام کے لیے وہ کس طرح قابلِ تقلید ہو سکتا ہے انسان کو شخصی زندگی قائم رکھنے والی چیزوں کے بعد جس اشد

ط[illegible] ہوتا ہے وہ نوع انسان کے گروہ کو یکجا جمع ہو کر رہنے کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر انسان ذاتی طور پر بالکل آزاد ہے اور کوئی چیز اس کو مقید نہیں کر سکتی لیکن اس کا اگر دوسرا رخ الٹا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک دوسری حیثیت سے وہ اسقدر ضعیف اور عاجز ہے کہ اس کو اپنی زندگی کی حفاظت کی غرض سے اس آزادی کا ایک بہت بڑا حصہ قربان کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے علمائے تمدن کا اتفاق ہے کہ انسان اپنی طبیعت کے برخلاف اجتماع کے لیے مجبور ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کی زندگی ناممکن ہے اور وہ اس سے کسی وقت بھی مستغنی نہیں ہو سکتا لہذا ظاہر ہے کہ وہ ایک دوسرے سے متحد ہو کر رہے۔

بجز دیوانوں اور فاترالعقل لوگوں کے باقی ہر شخص کی زندگی تقریباً ایک مربوط شیرازہ ہوتی ہے اس کے افعال کم و بیش ایک مرتب نظم و نسق کے تحت میں واقع ہوتے ہیں اول روز سے جب وہ اس عالم میں آنکھ کھولتا ہے تو اس کو ضروریات زندگی دوسرے کی طرف دست سوال دراز کرنے پر مجبور کرتی ہے، ایک شیرخوار بچہ کو جب بھوک بیتاب کرتی ہے تو وہ رو کر اپنی ماں سے دودھ طلب کرتا ہی جب وہ بڑا ہو جاتا ہے ستر پوشی کے لیے اس کو کپڑے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اس طرح جب شیر مادر سے اس کا تغذیہ ہو جاتا ہے تو حیوانات اور نباتات کی طرف اس کو اپنی توجہ مبذول کرنا پڑتی ہے جس قدر وہ ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر اس کی ضروریات زندگی بڑھتی جاتی ہیں اور روز بروز پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں۔

ان تمام ضروریات کو ایک فرد واحد کسی طرح تنہا انجام نہیں دیسکتا دیگر افراد بنی نوع مل کر اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں اور اس طرح ایک دوسرے کی ضرورت کی انجام دہی میں وقت صرف کرتے ہیں۔

ایک بڑھئی عمدہ عمدہ کرسیاں، الماریاں اور انواع واقسام کا فرنیچر تیار کرتا ہے وہ سب اس کی ذات خاص کے لیے بالکل بیکار ہے لیکن ایک عمدہ کوٹھی یا محل کے لیے نہایت ضروری ہے، بڑھئی کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ اناج اور کپڑا ہے۔ لیکن وہ خود اس کے پیدا کرنے یا بنانے سے عاجز محض ہے ایک کسان غلہ دیکر بڑھئی سے کولہو یا ہل تیار کرا لیتا ہے، لوہار سے دیگر آلات زراعت لیتا ہے دھوبی سے کپڑے دھلواتا ہے، درزی سے کپڑے سلواتا ہے۔ غرض ایک پیشہ ور کا کام دوسرے پیشہ ور سے بآسانی نکل جاتا ہے۔ اور اسی طرح متمدن زندگی ترقی کرتی جاتی ہے اب ہر جگہ کا جداگانہ تمدن کہ وہاں کے باشندے کس طرح اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی خاص قانون مقرر نہیں ہو سکتا۔ آزاد رد سے آزاد رد اور وحشی سے وحشی شخص بھی اپنے اجتماعی ماحول کے اثر سے کلیتہً محفوظ اور غیر متاثر نہیں رہ سکتا، جو جماعت قوم یا نسل جس آب وہوا یا خطۂ زمین میں بود و باش اختیار کرتی ہے اس کے ماحول سے اثر پذیر ہونا اس کو ناگزیر ہے۔

اسی وجہ سے مختلف ممالک اور مذاہب کا تمدن مختلف ہوتا ہے، یہی اخلاقی آب وہوا جس میں کوئی شخص زندگی گذارتا ہے اس کی خواہشوں کا اصلی عالم ہو جاتی ہے

لیکن اصولاً ہر انسان اپنی ذات کو ذات نہیں بلکہ کسی جماعت کا ایک جزو سمجھتا ہے یہ ایک ایسی واضح خصوصیت ہی کہ مِلؔ جیسے مصنف تک نے جو بعض حیثیات سے سخت انفرادیت کا قائل ہے اسی پر زور دیا ہے وہ کہتا ہے کہ "اجتماعیت اس قدر فطری اور لازمی شئے ہے کہ بعض غیر معمولی حالات یا عمداً تجرد کی کوشش کے سوا انسان اپنی ذات کا جماعت سے علیحدہ تخیل کر ہی نہیں سکتا اور جس قدر نوع انسان وحشیانہ عہد کی آزادی سے دور ہوتی جاتی ہے اسی قدر یہ شیرازہ زیادہ مستحکم و مضبوط ہوتا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسانی ماحول کی جو چیز کسی حالت اجتماعی کے لیے لازمی ہوتی ہی وہ روز بروز ہر فرد جماعت کے تخیل کا غیر منفک جزو بن جاتی ہے"۔

لہٰذا ہم جب کسی جماعت کو مشترک زبان، مشترک قانون، مشترک مذہب اور مشترک مقاصد کے رشتہ سے باہم پیوستہ دیکھتے ہیں تو ایک وسیع معنی کے لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کے تمام افراد ایک ہی عالم میں زندگی گزارتے ہیں۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں شخصی اور انفرادی امتیازات قائم رہتے ہیں، بعض اشخاص ان مشترک رشتوں سے کم وابستہ ہوتے ہیں اور بعض زیادہ، بلکہ بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر لمحہ ہر آن ان میں سے ہر ایک کے عالم میں کافی تغیر واقع ہوتا رہتا ہے، تاہم مقامی رسوم و ماحول کا اثر ان کے شخصی امتیازات پر غالب ہوتا ہی۔ دوسروں کے متعلق معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

روز مرّہ کے کاموں میں ایک دوسرے کی احتیاج بطور خود ہی کسی جماعت کے افراد میں ایک مجانست و موانست پیدا کر دینے کے لیے کافی ہیں اور جب اس پر تعلیم و تربیت کا اضافہ ہو جاتا ہے تو اس کی قوت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی زندہ مثال ہماری آنکھوں کے سامنے اہلِ یورپ اور بالخصوص اہلِ امریکہ موجود ہیں یہ لوگ ایک زبان رکھتے ہیں ایک قانون کی کڑی سے منضبط ہیں اور اپنے تمام اجتماعی مقاصد میں بھی ہم آواز ہیں، تعلیم و تربیت اتحاد و انسیت سونے پر سہاگا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ متمدن اور اپنی اسی ضروریاتِ زندگی میں بافراغت بسر کرتے اور دیگر اقوام پر بہت سی باتوں میں فوقیت رکھتے ہیں۔ موجودہ عظیم الشان جنگ میں امریکہ کا نمایاں حصہ اظہر من الشمس ہے۔

برخلاف اس کے ہندوستان ہے جہاں چپہ چپہ کی زبان مختلف، ہر قوم و جماعت کا مذہب نیا، ہر ایک کا جداگانہ قانون نہ کوئی غرض و غایت مشترک نہ اتحاد و موانست، ایک دوسرے کا دشمن، ایک کی ترقی دوسرے کے لئے باعث حسد ہے۔ جگہ جگہ کا رسم و رواج مختلف کسی ایک فرقہ کا لباس دوسری جماعت کے لیے باعث ننگ و عار ہے اور ایک قوم کا اکل و شرب دوسروں کے لیے باعث تضحیک و استہزا ہے۔ جہاں مغایرت کا یہ عالم ہو وہاں کی تمدنی حالت اور ترقی ظاہر ہے۔ اقوام سے لیکر ایک ایک فرد تک تمدنی زندگی سے کوسوں پیچھے ہے اور مجبوراً تقلید کا حامی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہمیشہ سے کسی نہ کسی متحد قوم کے زیر

اثر رہا ہے۔ اور ان کے طرز اور تمدنی معاشرت کو احتراماً واجب سمجھتا ہے۔

زمانہ حال کے مختلف مصنفین اس خیال کے حامی ہیں کہ جس طرح کسی جاندار کے جسم کے تمام اعضا میں ایک مشترک حیات کام کرتی ہے۔ اسی طرح کی ایک مشترک حیات انسانی جماعت کے مختلف اعضا یا افراد میں بھی پائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس خیال کو تمثیل کے پیرایہ میں پیش کیا ہے یعنی انسانی جماعتوں اور حیوانی یا نباتاتی اجسام کی ساخت میں وجوہ مماثلت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی تمثیلات بعض اوقات حقیقت فہمی میں معین ہوتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان سے بصیرت اور حقیقت رسی کی بجائے ذہانت اور طباعی کا ثبوت زیادہ ملتا ہے۔ ہر نوع انسانی شخصیت کوئی مستقل بالذات ہستی نہیں ہے بلکہ دوسری شخصیتوں کے ساتھ کچھ روابط قائم کئے بغیر اس کا تصور تک ناممکن ہے۔ انسان کی زندگی کا دارومدار انھیں روابط پر منحصر ہے۔ جن سے الگ کر لینے کے بعد یہ فنا ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ کسی عضو کو جسم سے کاٹ لیں تو وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ آدمی کی زندگی جس نصب العین اور جن اخلاقی رسوم و عوائد میں نشو و نما پاتی ہیں وہی اس کی اخلاقی زندگی کا تمام تر آب و رنگ ہوتے ہیں۔

فرائض تمدن

جہاں ماہرین فلسفہ متفقہ طور پر اس کے حامی ہیں کہ نوع انسانی کے تمدن پر ملک یا آب و ہوا، غذا، سرزمین اور

مناظر فطرت اپنا کافی اثر ڈالتے ہیں وہاں یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان سب میں سب سے زیادہ نتائج جس چیز سے انسانی تمدنی زندگی پر مترتب ہوئے ہیں وہ اس کی فراہمی دولت ہے ہر ملک و ملت میں جب ایک خاص حد تک دولت جمع ہو جاتی ہے اس وقت وہ مختلف طریقوں سے ترقی کرنا شروع کرتے ہیں، خود علم کی ترقی، دولت کی افزونی سے وابستہ ہے جس وقت تک ہر فرد خود اپنی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے میں ہمہ تن مصروف رہے گا۔ اس وقت تک نہ تو کسی کو اعلیٰ ترین مشاغل کا ذوق و شوق ہو گا۔ اور نہ اس کی فرصت ملے گی کہ کوئی جدید ترقی کی جا سکے۔ اگر کسی سوسائٹی کے تمام افراد اس قدر صرف کر دیں جس قدر کہ وہ کماتے ہوں تو ان کے پاس کچھ سرمایہ ان لوگوں کے لیے نہ بچے گا جو فراہمی سرمایہ کے ناقابل ہیں۔ لیکن اگر خرچ سے آمدنی زیادہ ہو گی تو با فراغت لوگوں کی ایک ایسی جماعت قائم ہو جائے گی جو زیرک و فہم و عقل و دانش میں اپنے سے زیادہ متمدن ممالک سے کسی طرح کم نہ ہوں گی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملک ترقی کرتا چلا جائے گا۔ اس وقت اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی کہ تمام اشخاص انفرادی حیثیتوں سے علٰحدہ علٰحدہ رزق رسانی کے لیے محنت کریں بلکہ وہ اپنا وقت اس سے زیادہ کار آمد کام میں صرف کریں گے اور علم و عقل کی روشنی میں مختلف طلسمات نیرنگ عالم دیکھ سکیں گے اور اس طرح ایجاد و اختراع کا دروازہ کھل جائے گا۔

اب ہم اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ قوانین انسانی اور حقوق الناس متمدن زندگی میں کس درجہ اثر رکھتے ہیں۔ یہاں یہ امر واضح ہوجانا چاہیئے کہ کسی سوسائٹی کی عادلانہ تنظیم کا انحصار صرف اکراہ اور اجبار پر موقوف ہوتا ہے۔ اس میں سلاطین وقت یا ان کے قوانین مروجہ کو بہت کم دخل ہوتا ہے کیونکہ وہ اقوام جو بالطبع مطلق العنان ہوتی ہیں ان کے لیے رعب سلطانی اور قوانین ملک بالکل بے اثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح پر وہ اقوام جو اصل معنوں میں امن پسند اور عاقل ہوجاتی ہیں تو ان کے لیے بھی قوانین کی فطرتاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی جو قوانین کہ ایک خاص وقت میں مفید ثابت ہوتے ہیں وہی دوسرے وقت بے کار اور بتدریج مضر ہونے لگتے ہیں۔ اس لیے بہترین اصول یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں سخت اور قطعی قوانین وضوابط قائم کیے جائیں افراد میں اس امر کی کوشش کی جائے کہ ان میں فضائل حسنہ پیدا ہوں اور اعمال و افعال پسندیدہ پیدا ہوں لیکن ابتدا میں ناروا آزادی کی روک تھام کے لیے قوانین کا وجود ضروری ہے۔ چونکہ جس چیز کو لوگ اول خوف سے کرتے ہیں وہ بتدریج عادت ہوجاتی ہے اور پھر اسی کو وہ اپنی شعوری آزادی سے انجام دینے لگتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اول قانون وجود میں آتا ہے پھر عادت اور پھر نیکی اصل منشائے قانون لوگوں کے حقوق و فرائض کی اقامت اور تنظیم ہے اور یہ دونوں چیزیں باہم لازم و ملزوم ہیں۔ جب ایک شخص کوئی حق رکھتا ہے

تو دوسروں پر نہ صرف اس حق کی حرمت فرض ہو جاتی ہے بلکہ ساتھ ہی اس حق کو فلاح عامہ کے لیے استعمال کرنے کا فرض بھی اس پر عائد ہو جاتا ہے۔ یعنی حقوق الناس کے یہ معنی ہیں کہ رفاہِ عام کے لیے اس کو بعض چیزوں کا مالک بنا دیا گیا ہے۔

حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اول حقوق اللہ دوم حقوق العباد۔ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ غایت تخلیق اشرف المخلوقات کی بنا یا انتہا صرف ان دونوں اقسام کے حقوق کا اپنی زندگی میں کامل طور پر انجام دینا ہے۔ حقوق اللہ سے وہ حق مراد ہیں جو خالق مطلق نے اپنی مخلوق کے ذمہ عائد کئے ہیں۔ ان حقوق کا ادا کرنا ہر فرد انسانی کے لیے خالق مطلق کی رضاجوئی کی غرض سے فرض ہے اگر اس کی غرض و غایت خوشنودی خالق نہ ہو گی تو وہ حق پورا نہ ہو گا۔ حقوق اللہ کی بابت اس قدر کہنا کافی ہے۔

دوسرے حقوق العباد ہیں ان میں سے بعض حقوق وہ ہیں جن کا تعلق افراد کی صرف اپنی ذات سے ہوتا ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو ایک شخص کے ذمہ دوسرے کے حقوق بحیثیت نوع انسان واجب ہیں ان میں سے سب سے پہلے ہم ذاتی فرائض کو لیتے ہیں۔ ہر شخص بخوبی واقف ہے کہ ترکیب انسانی دو اجزا سے ہوئی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل ممتاز ہیں۔ ان میں سے ایک جسم اور دوسرا روح ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ان کی

طبائع بالکل متغائر ہیں لیکن ان دونوں میں ایسا عجیب و غریب اتحاد پایا جاتا ہے کہ ایک کے متاثر ہونے پر دوسرا ضرور موثر ہوتا ہے۔ لہذا ہر انسان پر یہ فرض ہے کہ وہ ان دونوں جوہروں کی حفاظت بخوبی کرے۔ علامہ لاک لکھتا ہے کہ "وہ سعادت و فلاح جس سے دنیا میں فائدہ اُٹھانا انسان کے لیے ممکن ہے اس کے واسطے دو چیزیں لازمی ہیں اول عقل صحیح دوسرے جسم سالم" یہ دونوں نعمتیں تمام دیگر نعمتوں کی اصل ہیں۔ اور جس شخص کے پاس یہ دونوں موجود ہیں وہ خوش قسمت ہے کیونکہ یہی دونوں سعادت اور شقاوت کی بنیاد ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو دو قسم کی ضروریات ہوتی ہیں ایک وہ ضروریات جو نفسانی سعادت اور روحانی فلاح کو مستلزم ہیں اور دوسری جسمانی ضروریات جو جسمانی سعادت کو مستلزم ہیں اب نفسانی یا روحانی ضروریات تو وہ ہوئیں جن کے استعمال میں لانے سے انسانی نفس صحیح سالم اپنے فرائض کی انجام دہی کے قابل رہتا ہے جو اس دینوی زندگی میں اس کے ذمہ فرض کئے گئے ہیں۔

اب ان حقوق الناس میں سے جن کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے منجملہ دیگر حقوق کے اہم ترین حقوق حقوق زندگی آزادی، ملکیت، معاہدہ اور تعلیم قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

انسانی حقوق میں مقدم ترین حق زندہ رہنے کا ہے۔ اس سے مطلب

یہ ہی کہ تکمیل نفس ایک شخصی چیز ہی۔ ورنہ اگر اسکو غیر شخصی چیز تصور کر لیا جائے تو پھر شخصی حیات اس پر قربان ہو سکتی ہی۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نفس یا شخصیت کی تکمیل مقصود بالذات ہے وہ دراصل انفرادی نہیں ہے بلکہ ایک حد تک اجتماعی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض مواقع ایسے پیش آجاتے ہیں جہاں افراد کی قربانی جماعت کے لیے مستحق قرار دی جاتی ہے۔ لیکن یہ صورتیں در اصل مستثنیات میں سے ہوتی ہیں۔ عام طور پر یہ اصول مسلمہ نہیں ہی بلکہ عمومی حیثیت سے انسانی فلاح، انسانی حیات کی بقا اور تحفظ اس کی مقتضی ہی۔ اس لیے حرمت حیات کا حق تمام حقوق میں اول ہے۔ غیر متمدن اقوام میں اس حق کی حرمت کا لحاظ نہیں کیا جاتا اپنے ذاتی فوائد کو ملحوظ رکھ کر بچوں کو معرض ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں۔ ایران جنگ اکثر بے دریغ تہ تیغ کر دیئے جاتے ہیں۔ متمدن اقوام اس حق کا پاس و ادب زیادہ کرتی ہیں۔ اور حتی الوسع ان مواقع سے احتراز کرتی ہیں۔ جہاں اس حق کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہی۔

حق زندگی کے بعد حق آزادی ہی۔ انسان فطری اور خلقی طور پر آزاد پیدا کیا گیا ہے اس کو آزادی کی طرف رہنمائی کرنے کے لیے کسی ہادی کی ضرورت نہیں ہی۔ کیونکہ انسان میں آزادی کا احساس منجملہ ان احساسات کے ہی جس کی طرف انسان فطرتاً مائل ہوتا ہی۔ یہی وہ آزادی ہی جس کا شعور ہر ذی عقل انسان اپنے نفس میں پاتا ہے تمام تاریخی واقعات اور حادثات جو تمام اقوام میں ہوتے ہیں

اسی آزادی پر مبنی ہیں۔ وہ کون سی آزادی ہے جس کے وصول کی غرض سے یورپ نے نہایت جاں بازی کے ساتھ جہاد کیا ہے اور اپنی عزیز جانیں قربان کردی ہیں؟ وہ کون سی آزادی ہے جس کی نسبت میسو دی دیو (Deveux) کہتا ہے کہ۔ آزادی دنیا کی ہر قسم کی سعادت و فلاح سے افضل ہے" اور جس کی نسبت میسو پاچے لکھتا ہے کہ "آزادی ہر ایک انسانی ترقی کی اصل اصول ہے" اور جس کی وکٹر ہیگو اس طرح مدح سرائی کرتا ہے کہ "آزادی ایک ایسی ہوا ہے جو نفس انسانی کی زندگی کے لیے ایک ضروری چیز ہے" کیا اس آزادی سے یہ مراد ہے کہ انسان تمام قیود اور ہر قسم کے روابط سے آزاد ہو کر محض بے قید اور مطلق العناں ہو جائے۔ اگر آزادی کو اس کے ہم معنی کہا جاتا ہے تو یہ اس لفظ کا ناجائز استعمال ہے۔ خود سری یا مطلق العنانی کسی حالت میں بھی کسی خوش نظم یا متمدن سوسائٹی میں جائز قرار نہیں دی جا سکتی ہے۔ اس سے تو یہ مراد ہو گی کہ کسی جماعت کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ جو اس کا دل چاہے کرے۔ وہ آزادی جس کے اشتیاق میں تمام قوموں کے فلاسفر بے چین ہیں وہ معتدل آزادی ہے جس کی بدولت انسان اپنی تمام قوتوں کو جو قدرت سے اس کو عطا کی گئی ہیں بغیر کسی مزاحمت و خوف کے استعمال کر سکے۔ بشرطیکہ وہ ان حدود مقررہ سے متجاوز نہ ہو جو عادلانہ قوانین نے قرار دیدی ہیں کیونکہ اگر ان حدود سے تجاوز نہ ہو گا تو وہ قوم کے دیگر افراد

کے لیے مضر ثابت ہوگا اور اس طرح اصول تمدن کے خلاف ہوگا۔

اس معتدل آزادی کے ضمن میں نفس کی آزادی، عقلی آزادی، اور علمی آزادی آسکتی ہیں۔

حق آزادی کے بعد حق ملکیت آتا ہے اس سے جو فرض عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کو عاقلانہ اور عادلانہ طور پر فلاح عامہ کے لیے استعمال کیا جائے وہ اقوام جو اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتی ہیں ان کو یہ حق نہیں دینا چاہیے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی اقوام میں یہ حق بالکل مفقود ہے۔ افلاطون کا یہ خیال ہے کہ ایک اعلیٰ نظام حکومت میں تمام چیزیں مشترک ہونا چاہئیں۔ اس کے نزدیک ملکیت شخصی کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ یہی وہ اصول ہے جس کی بنا پر زمانہ موجودہ میں بالشویک حق ملکیت کو شخصی ملکیت سے نکال کر ہر فرد بشر پر یکساں مشترک ملکیت میں دینا چاہتے ہیں وہ افلاطون کے اس معنی میں بھی ہم خیال ہیں کہ عقد یا نکاح بالکل لغو شے ہے۔ توالد و تناسل یا ترقی نسل کے لیے من جملہ دیگر اشیار کے عورت کو بھی کسی شخص کی ملکیت میں نہ ہونا چاہیے اس مشترک یکساں ملکیت سے جو اقوام کو نقصان پہنچتے ہیں ان کا اندازہ ان اقوام کی حالت دیکھنے سے بخوبی ہو جاتا ہے جن میں یہ اصول عرصہ تک رائج رہے ہیں۔

دیگر اشیار کی مشترکہ ملکیت میں سے جو ایک حد تک ناممکن الوقوع ہی صنف نازک کو ہی لیجیے کہ جن مذاہب یا اقوام میں اس کا رواج ہے وہ آج مہذب اور متمدن

اقوام میں کس نظر سے دیکھے جاتے ہیں اگر تعصب سے کام نہ لیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ دراصل بے حیائی اور بے شرمی کا مجسمہ ہیں۔

حق معاہدہ وہ اخلاقی فرض ہے جس سے باہم ایک دوسرے سے جو معاہدہ ہو اس کو پورا کرنے کا فرض عائد ہوتا ہی تمدن کے ابتدائی درجات میں معاہدہ کوئی شے ہی نہیں ہوتی۔ اور ایفائے وعدہ سے ہر شخص ناآشنائے محض ہوتا ہے۔ وہاں قوتِ بازو فیصلہ کن رکن ہوتا ہے۔ ہر وہ فرد جس میں سے نسبتاً دوسرے اشخاص سے قوت وطاقت زیادہ ہوتی ہے وہ اپنا کام نکال لیتا ہے چنانچہ اسی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ "جماعتیں اپنی طبعی حالت سے معاہدہ کی طرف ترقی کرتی ہیں" جس کے یہ معنی ہیں کہ ہر متمدن سوسائٹی کا یہ فرض ہی کہ وہ اس عہد یا معاہدہ کو جو آپس میں طے ہو ہر حالت میں پوری پابندی کے ساتھ وفا کرے۔ اگر ایفائے عہد کسی سوسائٹی سے مفقود ہو جائے تو اس کے افراد میں اتحاد و موانست ایک منٹ بھی قائم نہیں رہ سکتا اور نتیجہ پوری جماعت کی بربادی ہوتا ہے۔

اسی طرح تعلیم سے وہ حق مراد ہے کہ جس کے ذریعے سے نفس عاقلہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایک اعلیٰ نظام اور متمدن سوسائٹی کے لیے نہ صرف تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم ضروری اور لازمی چیز ہے جس کے بغیر متمدن ہونا محال ہے۔ تمام کتب سیر اس پر شاہد ہیں کہ تمام وہ اقوام اور ممالک جو تمدنی ترقیات میں پیچھے ہیں وہ ہمیشہ سے تعلیم میں بالکل بے بہرہ رہی ہیں غیر متمدن زندگی کے زنگ کو جو چیز صیقل کرکے صاف کرتی ہے

اور اُس کو اُبھار کر متمدن طبقہ سے لا ملاتی ہے وہ صرف تعلیم ہے اس سے واضح ہو گیا کہ تمام جماعتوں کے لیے جو تمدنی زندگی میں فائق ہونا چاہتی ہیں یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے افراد کی تعلیم کا اعلیٰ انتظام کریں آج تمام وہ اقوام جو مدارج تمدن کے ملائے اعلیٰ پر نظر آتی ہیں صدیوں پہلے سے اپنے افراد کی تعلیم میں منہمک اور سرگرداں رہی ہیں۔ جب ان کے نفوس عاقلہ کی پوری طور پر تکمیل ہو چکی تو زمانہ کے متمدن افراد میں شمار ہونے لگی ہیں۔ یہاں تعلیم سے مراد کوئی خاص تعلیم مغربی یا مشرقی یا کسی خاص جگہ یا قوم کی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ تعلیم ہے جس کے ذریعے سے دماغ نشو و نما پا کر جہالت کی تاریکیوں سے نکل جاتا ہے۔

ان تمام حقوق الناس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ جس قوم و ملت کے ہم فرد ہیں اس کی اعلیٰ ترین ترقی اور فلاح و بہبود کے لیئے ہماری زندگی کے نشو و نما کو جو ذرائع اور وسائل درکار ہیں ان پر ہم کو پورا حق حاصل ہے اور تمام ذرائع اور وسائل کو اسی مقصد کے لیئے استعمال کرنا ہمارا تمدنی فرض ہونا چاہیئے۔

ترکیب تمدن انفرادی ہستیاں جب کسی ایک رشتہ میں منسلک ہوتی ہیں تو ان کی مختلف صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ من جملہ ان کے سب سے اوّل مجموعہ ایک خاندان یا قبیلہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ جماعت چند افراد کے باہم رشتہ قرابت سے وابستہ ہونے کا نام ہے۔ اس کا اصل اصول

موانست فطری ہوتی ہے اور یہی اس کے قیام کا باعث ہوتی ہے۔ اس کا مقصد
دراصل بیچارگیِ طفولیت کی حفاظت و خبر گیری اور فطری محبت و موانست کے ساتھ
ایک دوسرے سے ربط و اتحاد ہے۔ یہ نظام قدرتی طور پر اس خوش اسلوبی سے
انجام پاتا ہے کہ کوئی دوسرا نظام ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایام طفولیت یا شیر خوارگی
میں جو حفاظت اور خبر گیری والدین کرتے ہیں وہ بہتر سے بہتر بھی کوئی نظام
سلطنت نہیں کر سکتی۔ اسی طرح دوستی کا دائرہ جس قدر کم ہو گا۔ اسی قدر اس
میں پائیداری اور خلوص زیادہ ہو گا۔ خاندان کا ایک بزرگ مثل بادشاہ کے
ہوتا ہے اس کے خرد سب اس کے احکام کے ماتحت ہوتے ہیں۔ حسب مشورہ
خاندان وہ تمام امور کی انجام دہی کے لیے حسب مراتب احکام نافذ کرتا ہے۔
اور اس طرح تمام خاندانی کام انجام پاتے ہیں۔ اندرونی اور بیرونی تمام
معاملات خاندان کے سامنے پیش ہوتے ہیں اگر کوئی مسئلہ متنازع فیہ ہوتا ہے
تو وہ ہر دو فریق کے بیانات سُن کر بزرگ خاندان کے ہاتھوں سے طے پا جاتا
ہے۔ گویا خاندان ایک جمہوریت کا نمونہ ہے۔ گو چھوٹے پیمانہ پر ہو مگر اصول بالکل
یکساں ہوتے ہیں۔ اسی طرح چند خاندان مل کر جو ایک جماعت ہوتی ہے اس کو قوم
کہتے ہیں۔ قوم میں بھی مثل خاندان کے تمام ان حقوق کی بدرجۂ اکمل پابندی
ہوتی ہے۔ تمام قوم کا ایک سردار قرار دیدیا جاتا ہے اور اس کے مشورہ کے
مطابق تمام قوم کے مراحل طے پاتے ہیں۔ ہر فرد قوم کا اخلاقی فرض ہوتا ہے

کہ وہ تمدنی فرائض کی پابندی کرے ایک قوم بحیثیت اپنی ذات کے بمقابلہ دوسری اقوام کے متحد ہوتی ہے۔ بیرونی دشمنوں سے محافظت اور اندرونی معاملات کی تنظیم اس کا فرض منصبی ہوتا ہے۔ اب جب چند اقوام مل جاتی ہیں تو اس سے ایک ملک یا سلطنت کی بنیاد پڑتی ہے اور اس طرح حکومتیں اور سلطنتیں معرض وجود میں آتی ہیں۔

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ خاندانی تعلقات کی بنیاد باہمی فطری محبت پر ہوتی ہے لیکن اس سلسلہ سے قطع نظر کر کے ہم کاروباری زندگی پر سطحی نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے برعکس ہیں چونکہ کاروبار میں صرف باہمی معاہدہ ہی شرط ہوتی ہے۔ اس کو کوئی تعلق فطری جذبات سے نہیں ہوتا ہے وہاں تعلقات مربیانہ ہوتے ہیں۔ یہاں افسری اور ماتحتی کے تعلقات ہوتے ہیں۔ اگرچہ خاندان میں بھی یہی حاکم و محکوم کا رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن نوعیت جداگانہ ہوتی ہے وہاں کوئی ایک مربی اپنے کم سن متعلقین کی بحیثیت مربی تعلیم و تربیت کرتا ہے۔ یہاں صرف ایک معاہدہ ہے جس کے لیے وہ ایک خاص کام کے لیے مقرر ہوتا ہے اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے لیے ایسے قوانین و ضوابط ترتیب دیئے جائیں جن سے ماتحت لوگوں پر تشدد نہ ہو سکے۔ اور حاکم محکوم کو درجہ غلامی تک نہ پہنچا سکیں۔

زمانہ گزشتہ اور حال کا موازنہ ہم کو یہ بتاتا ہے کہ جس قدر زمانہ تمدنی ترقیات میں گامزن نظر آتا ہے اسی قدر خلوص و موانست میں کمی اور رسم و رواج میں

ترقی روز افزوں ہوتی جاتی ہے۔ زمانہ سابق میں ایک آقا اور خادم کا باہمی کاروباری تعلق مثل ایک خاندانی تعلق کے ہوتا تھا۔ جو معاہدہ کاروباری حاکم و محکوم میں ہوتا تھا وہ موانست و خلوص کی زنجیر سے مستحکم ہو جاتا تھا۔ آقا کا اخلاق خادم کے اخلاص پر سیمنٹ کا کام کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آقا کا برتاؤ مربیانہ ہوتا تھا اور خادم کا طرز عمل مودبانہ اور مخلصانہ۔ آقا کی خوش حالی اور تنگ نامی سے خادم کو دلی مسرت ہوتی تھی اور اس پر کسی قسم کی مصیبت خادم کے لیے سوہان روح ہوتی تھی۔ لیکن فی زمانہ یہ باتیں محض افسانہ ہو کر رہ گئی ہیں کہ وفادار خادم اپنے آقاؤں کے لیے اپنی عزیز جانیں تک قربان کر دیتے تھے۔

اسی طرح استادوں اور شاگردوں کا برتاؤ مخلصانہ اور مربیانہ ہوتا تھا۔ شاگرد اپنے اساتذہ کا خیال اپنے والدین سے زیادہ کرتے تھے۔ ان کے ادب میں اپنی بہبودی تصور کرتے تھے۔ کسی خاص علم کے استاد کی شاگردی کو اپنا فخر جانتے تھے اور صدہا کوس کی منازل پاپیادہ طے کر کے ان کے پاس پہنچتے تھے اور بالآخر ارسطوئے زماں اور افلاطون دوراں ہوتے تھے۔ علمائے سلف کے سوانح اس پر شاہد ہیں کہ وہ اپنے شاگردان رشید کو مثل اپنی اولاد کے تربیت دیتے تھے اور سچے دل سے چاہتے تھے کہ جو کچھ وہ خود جانتے ہیں وہ سب اپنے شاگردوں کو ذہن نشیں کرا دیں۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر شاگرد اپنے استاد سے

کسی خاص فن میں زیادہ ماہر ہو جاتے تھے جن پر خود اُستاد فخر کرتے تھے اور وہ ان کے لیے مایۂ ناز ہوتے تھے اور اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ اُستاد اور شاگرد کا برتاؤ بے حد خلوص پر مبنی ہوتا تھا۔

برخلاف اس کے موجودہ زمانہ میں ہر طالب علم یہ سمجھتا ہے کہ وہ کچھ روپیہ خرچ کرتا ہے جس کے بدلہ اس کے اُستاد کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کو تعلیم دے اور وہ بھی ایک خاص وقت معینہ پر۔ استاد یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک مقررہ رقم کے عوض ایک محدود وقت میں اپنا کچھ حصہ وقت صرف کریں بلالحاظ اس کے کہ ان کا مقصد اصلی حاصل ہو یا فوت۔ نہ ایک دوسرے کا خیال، نہ ادب، اور نہ پاس، نہ اخلاص، نہ مودت۔ نتیجہ یہ ہے کہ شاگرد محض ڈگری یافتہ عالم بے عمل ہوتے ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب مربیانہ تعلق کسی فطری رشتۂ محبت پر مبنی نہیں ہوتا تو اس میں کسی قسم کا خلوص باقی نہیں رہتا محض رسمی ضابطہ کی خانہ پُری رہ جاتی ہے اور آگے چل کر اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ اب اگر کاروباری تعلقات خالص معاہدانہ حیثیت کے ہونگے تو ایک حد تک ناانصافی کے لیے ضرور سدباب ہو جائیگا اور پھر خود بخود رفق وفاداری اور محبت کے جذبات پیدا ہو جائیں گے لیکن اگر خود معاہدہ ہی محض رسماً اور رواجاً ہوگا تو اس کا اثر بالکل برعکس ہوگا۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ماتحتی کی سختی اور ناگوار صورتوں کے کم کرنے کے لیے معاونت اور اتحادِ عمل یعنی تعامل و تعاون کی صورتیں اختیار کی جائیں تاکہ مودت پیدا ہو۔

اگر لوگوں کے کاروباری تعلقات کو محض معاہدانہ رکھنا ہی ہو تو ان مربیانہ اور ہمدردانہ فرائض کو جو افراد کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑے جا سکتے ہیں ایک خاص جماعت کو من حیث المجموع اپنے ذمہ لینا چاہئیں۔ اگرچہ یہ کام ایک مرکزی حکومت کا ہے لیکن یہ کام ہر شہر خود انجام دے سکتا ہے۔ مثلاً حفظانِ صحت کا انتظام، وسائل تعلیمی کی فراہمی، حادثات کی روک تھام بصورت حفظ ماتقدم، اشیاے خوردنی میں میل یا اور دھوکہ بازی کا انسداد۔ اسی طرح وہ لوگ جو محنت و مزدوری کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتے ان کے لیے ضروریات زندگی کی فراہمی وغیرہ یہ سب امور تمدنی زندگی کے لیے لازمۂ انسانیت ہیں۔

ان تمام امور متذکرہ بالا کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ آیا کسی قوم کو انفرادیت کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے یا اشتراکیت کی طرف اس مسئلہ پر دو گروہ جداگانہ متضاد رائے رکھتے ہیں۔

جماعت انفرادیہ کا یہ خیال ہے کہ تابہ امکان افراد کی آزادی کو قائم رکھنا زیادہ اہم ہے لیکن دوسرا گروہ اشتراکیہ یہ کہتا ہے کہ اصلی شے افراد کے افعال کو فلاح عام کے نقطۂ نظر سے منضبط اور محدود کرنا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو

ان دونوں مخالف آرار کی تطبیق اس صورت سے بآسانی ممکن ہے کہ نہ تو کل کی فلاح بغیر افراد کی فلاح کے ممکن ہو اور نہ ہر شخص کو انفرادی آزادی بغیر اس شرط کے دیجاسکتی ہو کہ بہ حیثیت مجموعی اس میں کوئی عام فلاح مضمر ہو لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ کن چیزوں میں لوگوں کو زیادہ آزادی دینا مستحسن ہے اور کن چیزوں میں ان کے افعال کی نگرانی اور تحدید ضروری ہے۔ بہرحال زمانہ موجودہ عمومی ترقی کے لیے اشتراکیت کا زیادہ حامی نظر آتا ہے اور فی الحقیقت یہی اصلی تمدن ہے۔

سیاست مدن سیاست مدن تمدنی منزل میں حکمت عملی کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو ایک قوم اور ایک شہر یا ایک ملک کے باہمی تعلقات کے حفظان کے متعلق اُن اصول سے بحث کرتا ہے جس سے تمام افراد میں طریقہ عدالت جاری اور ساری رہتا ہے اور جس کی وجہ سے تمام افراد ترقی اور بہبودی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

ضروریات زندگی میں تعاون و تعامل کا لازم ہونا بیان کیا جاچکا ہے فطرت نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اس لیے سوسائٹی میں اعلیٰ وادنیٰ شخص پورا آزاد اور مختار ہے لیکن بعض اوقات اعلیٰ شخص ادنیٰ پر بیجا دباؤ ڈالتا ہے اور اس کی آزادی میں مخل ہوجاتا ہے اس لیئے یہ ضرورت پیش آئی کہ ابنائے جنس ایک دوسرے کی آزار رسانی سے محفوظ رہیں اور ہر شخص سوسائٹی میں اپنے اپنے مراتب کے مطابق عمل کرتا رہے اور اگر کوئی ایسا کام کرے جس سے سوسائٹی

کو نقصان پہنچے تو اس کو سزا دیجائے تاکہ آیندہ اس کو تنبیہ اور دیگر افراد کو عبرت حاصل ہو۔ تمدن کی ابتدائی حالت میں تمام سوسائٹی کو یہ اختیار تھا کہ جب سوسائٹی کے کسی ممبر سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا تو سب مل کر اس کے لیے سزا تجویز کر دیتے تھے۔ جرائم اور مجرموں کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف سزائیں تجویز کی جاتی تھیں اور اسی کے مطابق ان کو فیصلہ سُنایا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان مختلف فیصلوں نے قانونی صورت اختیار کر لی اور سوسائٹی کے ان اقتدارات کا نام جو لوگوں میں قاعدہ عدالت قائم رکھیں اور جو فرد اس قاعدہ کے خلاف ورزی کرے اس کو سزا دیں سیاست کہلانے لگا۔

شروع میں ہر مقدمہ میں سوسائٹی کے ہر فرد کو رائے دینے کا استحقاق یکساں تھا اور ہر ممبر کو یہ حق تھا کہ وہ قانون وضع کرے اور اس کا نفاذ کرے گویا اس میں ایک جمہوری سلطنت کی سی شان تھی۔ لیکن جب متمدن سوسائٹی میں ترقی ہوئی اور افراد میں ان کے حالات اور مذاق کے اعتبار سے کام تقسیم ہوئے تو ایک مقدمہ کے لیے تمام افراد کا جمع ہونا نہ صرف ان کے ذاتی کاموں میں ہی خارج ہوا بلکہ ایک طرح محال ہو گیا اس لیے انفصال مقدمات کے اختیارات ایک شخص واحد کو دیدیئے گئے اور اس کا نام قاضی یا منصف ہوا لیکن قوانین سازی سوسائٹی کے ہاتھ میں رہی۔ منصف کا کام ان منضبط قوانین قوم کے مطابق مجرموں کو سزا دینا قرار پایا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی ضرورت بھی پیش آئی

کہ اس سوسائٹی، شہر یا ملک کی حفاظت بیرونی حملوں سے کی جائے تاکہ امن قائم رہے اس لیے فوج کا قیام ضروری ہوا۔ جماعت میں سے چند اشخاص جو اس کام کے لیے موزوں و مناسب تھے فوج میں بھرتی کیے گئے اور ان کا جداگانہ قانون بنایا گیا۔ صلح و جنگ کا اختیار اور اس فوج کی عناں حکومت ایک خاص شخص کی سپرد کی گئی تاکہ وہ صرف انہیں امور پر اپنا وقت صرف کرے۔

اسی کو اندرونی اور بیرونی نقصانات کی تلافی کے تمام اختیارات دیئے گئے اور اس کا نام حاکم یا بادشاہ ہوا۔ اب فوج کے لیے جو بجز محافظت قوم اور کوئی کام انجام نہیں دے سکتی تھی یا حاکم وقت کی ضروریات کے لیے خرچ کی ضرورت لاحق ہوئی۔ چونکہ وہ اپنے لیے جداگانہ اکتساب معاش سے قاصر تھے اس لیے تمام سوسائٹی کے ذمہ ایک محدود رقم مقرر کی گئی اور اس کا نام ٹیکس یا خراج ہوا۔ اس ٹیکس کی آمدنی کچھ عدالت اور افواج کے اخراجات میں صرف ہوتی تھی اور حسب ضرورت بادشاہ کے صرف میں آتی تھی۔ عوام الناس بادشاہ کی عزت کرتے تھے اور اس کے احکام کی تعمیل۔ لیکن اگر وہ خلاف قانون کوئی حکم کرتا تھا تو سوسائٹی کے ہر فرد کو اس کو متنبہ کرنے کا حق ہوتا تھا۔

جنگ کے موقع پر بادشاہ کی سپرد تمام انتظامات ہوتے تھے اور امن و صلح کے زمانہ میں اس کی حیثیت دیگر رؤسا شہر کی برابر ہوتی تھی باقی سلطنت کا نظم و نسق رعایا کونسل کی صلاح اور مشورے سے انجام پاتا لیکن بادشاہ کا اقتدار

زیادہ ہوتا تھا اور اس کا ادب رعایا پر فرض تھا۔

اس طرح تمدن نے ترقی کرتے کرتے سلطنت قائم کرلی لیکن یہ سلطنت جمہوری سلطنت تھی جس میں بادشاہ یا حاکم کا انتخاب سوسائٹی یا رعایا کی رائے سے ہوتا تھا۔ قیام سلطنت کے بعد ہر فرد مجرم کو سزا دینے کا مستحق نہیں رہا بلکہ وہ عدالت سے سزا دلا سکتا تھا۔

مطلق العنانی یا غیر متمدن حالت میں اگرچہ ہر فرد کے اختیارات وسیع تھے لیکن اس آزادی کا فائدہ مفقود تھا اور اس آزاد زندگی میں کوئی بھی اپنی حفاظت خود نہیں کرسکتا تھا۔ اس وقت نہ تو کوئی قاعدہ، قانون تھا جو سب کے لیے یکساں ہو اور نہ جائز ناجائز کوئی معیار تھا بلکہ ایک ہی نوعیت کے مقدمات کے فیصلے مختلف طرائق سے ہوتے تھے اور اکثر میں طرفداری اور رعایات مدِنظر رکھی جاتی تھیں، دوسرے کوئی ایک شخص مسلمہ طور پر منصف نہ تھا بلکہ ہر شخص خود ہی واضع قانون بھی ہوتا تھا اور خود ہی قانون نافذ کرتا تھا۔ اور خود غرضی کی بنا پر انصاف نہ ہوسکتا تھا۔

جب سلطنت جمہوری قائم ہوئی تو اس نے امن عامہ کو قائم کیا۔ قوانین وضع کیے اور ان کے مطابق حکمرانی کی اور سوسائٹی میں نصفت و عدالت قائم کی اور ملک و سوسائٹی کو اندرونی اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھا۔ چونکہ قوانین کے وضع کرنے کا اختیار سوسائٹی کے ہر فرد کو تھا اس لیے اس

میں بھی وہی دقت ہوئی کہ ہر شخص اس کو انجام نہ دے سکا اس لیے کل قوم نے اپنے سربرآوردہ اشخاص کو اپنی طرف سے اس کام کے لیے منتخب کر دیا جو عقل و دانش اور علم و لیاقت میں دوسروں سے ممتاز تھے اور سب نے اس کو تسلیم کر لیا کہ ان کے وضع کردہ قوانین پر ہر شخص عمل پیرا ہو گا اور کسی کو اختلاف نہ ہو گا۔ اس مجلس کو واضع قوانین یا لیجسلیٹو کونسل کے نام سے موسوم کیا۔ یہ وہ جماعت ہوتی ہے کہ جب اس کو ذی اختیار بنا دیا جاتا ہے تو تمام افراد قوم پر اس کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت فرض ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مقنن کے اختیارات سب سے زیادہ ہوتے ہیں لیکن وہ قانون بنانے میں بالکل خود مختار نہیں ہوتا بلکہ اس کو امور ذیل کا پابند ہونا لازمی ہے۔

اول وہ اس امر کا خیال رکھے کہ وہ ایسے قوانین وضع کرے جن سے قوم و ملک کی حالت درست ہو اور وہ خلاف فطرت نہ ہوں بلکہ ہر ایک میں قوم کی فلاح و بہبودی متصور ہو۔

دوسرے وہ ایسے قوانین منضبط کرے جو ہر شخص کے لیے یکساں حکم رکھتے ہوں۔ افراط و تفریط سے بری اور عدل و انصاف پر مبنی ہو۔

تیسرے ان قوانین میں خلائق کی جان و مال کی حفاظت مدِ نظر ہو اور ٹیکس یا اخراج کا مقرر کرنا بغیر استفسار رائے قوم بے حد و حساب نہ ہو۔

چوتھے وہ قوانین مستقل ہوں اور جلد جلد ان میں تغیر و تبدل نہو۔

جس شخص کے ہاتھ میں عنان حکومت ہو اس کو خاص خاص ایسے اقتدارات بھی حاصل ہونا چاہئیں جو قانون مروجہ سے برتر ہوں۔ چونکہ بعض اوقات ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں جہاں مقنن کا قانون کوئی ہدایت نہیں کرتا اس وقت چاہیئے کہ وہ اپنی ذاتی رائے سے فیصلہ کرے۔

غرض یہ سلطنت جمہوری ایسی سلطنت ہے کہ نیچرل یا فطری حالت میں جو اقتدارات و اختیارات لوگوں کو فرداً فرداً حاصل تھے وہ انہوں نے سوسائٹی کو دیئے اور پھر سوسائٹی نے وہ ایک حکمران اور اس کے ماتحت چند افسران کو اس شرط پر دیئے کہ وہ ان کی جان و مال، عزت و آبرو کی ہر طرح حفاظت کرے اور ان کی بہبودی اور ترقی میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ لیکن اس کو لوگوں کی جان و مال پر خود مختارانہ اختیار حاصل نہیں ہو سکتا۔

جب سوسائٹی تمدنی زندگی کی آخری منزل پر پہنچ جاتی ہے تو اس کے قوانین عدالت اعلیٰ پیمانے پر ہوتے ہیں اور اس کی گورنمنٹ اپنے تمام افراد کی بھلائی اور بہبودی کے لیے اور تمام سوسائٹی کے انتظام کے خاطر تمدنی اصول وضع کرتی ہے اور ان کو مشتہر کرتی ہے اور رعایا کو ان پر کاربند رکھتی ہے۔

وضع قوانین، عدالت و سیاست، نظم و نسق، آئین ملک اور انتظام ایک عمدہ گورنمنٹ کا فرض ہے۔

صلح کل، امن جوئی، معاونت وہمدردی اور حفاظت تمدن کے معاون ہیں۔ لیکن دشمنی، حسد، زبردستی، جور وظلم، اور خانہ جنگی تمدن میں رخنہ انداز ہوتے ہیں جن سے اجزائے عالم کا مضبوط شیرازہ بکھر جاتا ہے اس لئے گورنمنٹ خرابی کی رخنہ بندی اور مظلوم و مستحقین کی حفاظت کرتی ہے۔

اسلامی تمدّن

تمدن اسلام

تمدنی مسائل پر اس قدر تفصیلی مباحث کے بعد ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ اسلامی دنیا کے تمدن کو پیش کریں اور اس سے یہ ثابت کریں کہ علمائے یورپ کے اعتراضات جو مذہب کے بارے میں طعن و تشنیع سے پر ہیں کس حد تک درست ہیں تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اسلامی تمدن کس حد تک ان تمام فرائض تمدنی کی تعلیم دیتا ہے اور اس کا متمدن اقوام میں کیا حصہ ہے؟ محاسن اسلام سے صرف وہی اشخاص واقف ہو سکتے ہیں جو تعصبات دینی سے بے لوث ہوں اور جن کی بصیرت کو خداوند تعالیٰ نے نور عرفاں سے روشن کر دیا ہو اور جن کے آسمان ذہانت پر آفتاب علم پرتو فگن ہو ورنہ ان کی نفسانی روشنی طبع کی خیرگی شب جہالت کی تاریکی میں ان کو اس قسم کے محاسن بھی معائب کر دکھائے گی۔

یہ کسی خاص مذہب کی مدح سرائے نہیں ہے بلکہ واقعات زمانہ اور علوم و عقول اس دعوے کی تائید کرتے ہیں کہ مذہب اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو در اصل طبعی کہلائے جانیکا مستحق ہی یہانتک کہ موجودہ بیسویں صدی میں جو ہر لحاظ سے متمدن اور مہذب سمجھی جاتی ہے اس کے نصوص آفتاب سے زیادہ روشن ہو گئے ہیں اور جس طرح شعاع آفتاب پانی میں سرایت کر جاتی ہیں اسی طرح وہ نصوص عقول انسانی میں نفوذ کر جاتی ہیں۔ کوئی قاعدہ جو تجربات انسانی سے ثابت ہوا ہو اور

کوئی منظریہ جو حواس خمسہ نے قائم کیا ہو۔ ایسا نہیں پایا جاتا جو انسانی تہذیب اور شائستگی کی ترقی میں موثر ہوا اور وہ کسی نص قرآنی یا احادیث نبوی کی صدائے بازگشت نہو۔ اگر ذرا غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمائے روئے زمین جس قدر انسانیت کی شان کی ترقی میں سعی بلیغ اور کوشش ناتمناہی کرتے نظر آتے ہیں ان کا مقصود صرف یہی ہے کہ مذہب اسلام کے قواعد کی صحت اور صداقت پر دلائل و براہین قائم کریں۔

یہ امر تو اظہر من الشمس ہے اور اپنے دعوے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں رکھتا کہ مسلمانوں کے تمدن کی بنیاد جزیرہ عرب میں قائم ہوئی اور بہت ہی قلیل عرصہ میں اس کی شاخیں تمام ممالک مشرقیہ اور مغربیہ میں پھیل گئیں۔ تمدن کا وہ تخم جو اسلام نے عرب کی اوسر زمین میں بویا تھا اور جس کا پودا ابھی نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ ہر چہار طرف سے اس کی بیخ کنی میں انتہائی سعی لاحاصل ہوئی اور بالآخر وہ تمام انسانی مخالفتوں میں روحانی نصرت سے سرسبز ہو کر نخل بارآور ہوا اس کی روشن دلیل ہے کہ یہ ہمیشہ کے لیے ہے اور جب اس کی ملائم اور نازک شاخیں ہی باوجود انتہائی طاقت انسانی جنبش نہ کھا سکیں تو اب یہ تناور درخت چودہ سو سال کا پرورش یافتہ کس صورت سے ہل سکتا ہے۔ یہی وہ شجر بارآور ہے جس کے شیریں ثمرات سے نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ تمام ذی عقل اقوام آج فائز المرام ہو رہی ہیں اور ان اصول تمدن پر کاربند ہو کر مہذب دنیا میں آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہی ہیں اور تمام ان

اقوام کو جنہوں نے ان زرین اصول کو چھوڑ دیا ہے یا ان کی پیروی میں مذہبی تعصبات سے عدم توجہی کی ہے غیر مہذب اور غیر متمدن ہونے کا طعن دے رہی ہیں۔

تواریخ اور علوم تمدن کا استقرار کرکے ہر شخص اس امر پر استدلال کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کا تمدن تمام دنیا کے تمدنوں کی نسبت زیادہ سریع السیر، زیادہ شاندار، عجیب قوی اثر ڈالنے والا اور ہر قسم کے تمدنی صلاح و فلاح کا جامع ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ پر منصفانہ سرسری نظر ڈالنے سے یہ تمام باتیں مجسمہ بنکر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

عربوں کی قبل از اسلام ابتدائی حالت کو غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے طرز معاشرت میں وحشت اور جہالت سے کس قدر قریب تر تھے اور تمدنی فرائض سے محض ناآشنا تھے وہ اپنے اعتقادات باطلہ اور اوہام پرستی میں بھی اپنی دیگر ہم عصر اقوام سے کچھ کم نہ تھے ان میں سے بعض بعث و نشر کے قائل نہ تھے بلکہ اسی دنیوی زندگی کو ابتدا اور انتہا تصور کرتے تھے۔ ارواح بزرگان اور آسمانی فرشتگان ان کے خیال میں ہر کام کی انجام دہی کے لئے مختار کل سمجھے جاتے تھے چنانچہ انہیں کے اصنام اور تصاویر کی وہ پرستش کرتے تھے۔ ہر قبیلہ کا جداگانہ ایک معبود ہوتا تھا جو ان کے تمام دنیوی کاروبار میں دخیل ہوتا تھا اور بوقت ضرورت وہ اس کو اپنا مشیر کار سمجھتے تھے گو بعض قبائل خدا کی عظمت کو بھی مانتے تھے لیکن اصنام کو اس کا نائب جانتے تھے اور فرشتگان، خدا کی بعض دختران کو تصور کرتی

تھے۔

شراب خوری۔ قمار بازی اور دیگر معشرتی عیوب ان کے اصل اصول تھے۔ بغض و حسد کینہ و عداوت میں اپنی آپ ہی نظیر تھے۔ ایک قبیلہ کی مخالفت کا سلسلہ دوسرے قبیلہ سے پشتہا پشت تک علی التواتر قائم رہتا تھا اور ایک معمولی سی عداوت میں صدہا خون بہا دیئے جاتے تھے اور پھر بھی صبر نہ آتا تھا۔ اولاد اناث سے ان کو طبعًا نفرت تھی اور ایک باپ اپنی حقیقی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کر دیتا تھا اور اس کے فطری جذبات پدری میں جنبش تک نہوتی تھی۔ درس و تدریس سے ان کے دماغ بالکل کورے تھے گو شاعرانہ تخیلات میں ہر فرد سرشار تھا۔ بزم سے وہ ناواقف تھے لیکن رزم کی ہنگامہ آرائیاں ان کا روزانہ کا پروگرام تھیں اور جدال و قتال ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جو ایامِ جہالت سے تعبیر کیا جاتا تھا اور ابتک بھی اس نام سے موسوم ہے۔

جب عربستان کے افق پر جہالت و وحشت کا اسقدر ابر محیط چھا رہا تھا اور ظلمت و جہل کی تاریکی میں ہر شخص خود پرستی میں مست نظر آتا تھا۔ اس وقت اسلامی تمدن کا آفتاب مشرق مکہ طلوع ہوا اور اپنی ضیاء عالمتاب سے شب جہالت کی تاریکی کو نور تہذیب و تمدن سے منور روشن کر دیا آغاز اسلام کا کچھ زمانہ دورِ قدیم کو عہد جدید سے تبدیل کرنے کی مشکلات میں گذرا اور جن مصائب و آلام کا اس کو سامنا کرنا پڑا وہ بذاتِ خود اسقدر سخت تھے کہ اگر تائید ایزدی شامل حال نہوتی تو

ان کی برداشت طاقت بشری سے باہر تھی ۔

اگرچہ تاریخی انقلابات ہمیشہ سے اپنے ساتھ مصائب و آلام کی سختیاں لاتے ہیں لیکن جن دردناک مصیبتوں میں آغاز اسلام کے گروہ مبتلا ہوئے ان کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ خدا کا ایک شکر گذار بندہ محض اس قصور پر کہ وہ اس نورانی شعاع سے متمتع ہوا ہے عرب کے جلتے ہوئے ریت پر گھٹنوں گھسیٹا جاتا ہے گرم ترین پتھر اس کے سینہ پر رکھے جاتے ہیں لیکن وہ اس نورانیت سے ظلمت کی طرف رجعت قہقری پر ان جسمانی تکالیف کو ترجیح دیتا ہے اور ان کو نہایت صبر کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ حضرت حبیب رضی اللہ عنہ کو قید کیا جاتا ہے اور پھر جلتی ہوئی آگ میں ڈالا جاتا ہے اور پھر اس میں سے نکال کر قتل کر دیا جاتا ہے لیکن وہ نہایت استقلال سے اپنے عہد پر قائم رہے۔ یہ اور اس قسم کی بہت سی مثالیں اس وقت کی تاریخ کی ورق گردانی سے مل سکتی ہیں جن سے ایام جہالت کے غیر متمدن حالات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے اور اس قوم کے ظالمانہ اور بے رحمانہ سلوک کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تو عرب کی تصویر کا تاریک رخ تھا جو دنیا کے سامنے قبل از اسلام رہا۔ لیکن مذہب کے سرچشمہ سے فیضیاب ہونا تھا کہ یہی وحشی اور جاہل قوم اور یہی غیر مذہب اور ناشائستہ لوگ تھوڑے ہی زمانہ میں مکارم اخلاق کا بہترین نمونہ بن گیا اور اس تصویر کا روشن رخ نظر آنا شروع ہو گیا یہی وہ قوم تھی جس میں صرف مذہب کی بدولت آگے چل کر ہم کو ایسے لوگ نظر آئینگے جن کے اخلاق حمیدہ اوصاف پسندیدہ ان اقوام سے بدرجہا بہتر ہیں جنہوں نے علم و

حکمت کے خاندانوں میں تربیت پائی ہے ہم کو عظمت و شہامت، فضائل و کمالات
کے ایسے نمونے نظر آئیں گے جو اپنے آپ ہی نمونہ ہیں ہم کو زہد و اتقا و ورع و پرہیزگاری
کی ایسی نظیریں ملیں گی جو حکمائے اخلاق کو ان کی تصنیفات و تالیفات کے بین نقائص
سے آگاہ کرتی ہیں۔ اب اس موازنہ کے بعد بقول بعض فلاسفران یورپ یہ کہنا کہ
تمدن سبب ہے اور مذہب اس کا نتیجہ کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ ہر شخص بلا تامل
کہہ سکتا ہے کہ انسانی تمدنی رفتار روز افزوں ترقی کی طرف مائل ہے اور اقوام کی
عروج و زوال میں ان کا مذہب بہت کچھ دخیل ثابت ہوا ہے اور متعدد جنسوں سے
ان کا تمدن ان کے مذہب سے وابستہ رہا ہے یہ صرف مذہب کا کام تھا جس نے
قوم عرب کو پستی اور حضیض نکبت سے نکال کر مدارج اعلیٰ پر پہنچا دیا۔

بعض ملحدین اس کے قائل ہیں کہ مذہب سرے سے کوئی چیز ہی نہیں ہے یہ
محض ایک ڈھکوسلا ہے۔ درآنحالیکہ قدیم ترین تواریخ بھی اس پر شاہد ہیں کہ جاہل
سے جاہل قوموں میں بھی مذہب کوئی چیز ضرور رہی ہے اس لفظ کا استعمال
مرور ایام سے اس وقت تک پایا جاتا ہے۔ تمام اقوام خواہ وہ مہذب ہوں یا وحشی
اس کے نام سے بخوبی واقف ہیں لیکن مختلف اقوام نے اپنے اپنے ادراک اور
فہم کے مطابق اس کو نئے نئے جامے پہنائے ہیں اور اس لفظ کے مختلف معنی سمجھے
ہیں۔ قدیم ترین زبانوں میں مذہب کے معنی بالکل مختلف تھے وہ لوگوں معبودوں
کی رضا جوئی اور ان کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے حیوانوں اور انسانوں کی

قربانی تک جائز رکھتے تھے اور صرف یہی انکا مذہب تھا لیکن جیسے جیسے انسانی عقول میں علوم وفنون سے نشو ونما ہوتی گئی ویسے مذہب کے اصل معنی ان کی سمجھ میں آتے گئے۔ اور اس لفظ کا مفہوم بالآخر ان معنوں کے قریب تک پہنچ گیا جو کہ آسمانی مذاہب کا حکم ہے اور خود علمائے یورپ علمی فتنوں میں مبتلا ہو کر انہیں اصول کے قریب قریب پہنچ گئے ہیں جنسے وہ بعید تر تھے اور عبادات جسمانی اور روحانی کے وہ لوگ اب قائل نظر آتے ہیں چنانچہ اس کا ایک مشہور فلاسفر چارلس سیمون لکھتا ہے کہ "ہم اس زندگی میں ان فرائض کی انجام دہی کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے ہمارے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔ اور جب ہماری زندگی ختم ہو جائے گی تو جزا اور سزا اور عذاب وثواب کا خدا کو اختیار ہے" آگے چل کر اعتقاد کے بارے میں وہی لکھتا ہے کہ "جو چیز انسان کے لیے باعثِ ثواب ہو سکتی ہے وہ اپنی خاص قوتوں کی اطاعت اور کارِ خیر کی انجام دہی ہے۔ یہ قانون انسانی ہے کہ وہ اپنی ذات کی حفاظت کرے اور ان قوتوں کو ترقی دینے کی کوشش کرتا رہے جو اس میں ودیعت کی گئی ہیں۔ اپنے بھائیوں سے محبت کرے اور مخلوق خدا کی خدمت کرے خالق کے ساتھ محبت کرے اور اس کی عبادت کرے لیکن وہ کیا طریقہ ہے جس کے مطابق انسان کو خالق کی عبات کرنا چاہیئے؟ وہ دراصل ادائے فرائض ہے۔ اور کارِ خیر عین عبادت ہے۔ محبت اور اخلاص عین نماز ہے حب الوطنی خدا کی عبادت ہی سے ہے۔ ہم کو لیے خالق کے وجود کا اعتقاد رکھنا چاہیئے جو ہر چیز پر قادر ہے

اور میں کو کوئی چیز متغیر نہیں کر سکتی۔ اسی نے تمام عالم کو پیدا کیا ہے اور قوانین فطرت اس پر فرض کر دئیے ہیں اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اُخروی زندگی ہوگی جس میں انسان کو اپنی نیکیوں اور بدیوں کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے اور یہی ہماری تمنا ہے کہ ہمارا دل خدا کی محبت اور نیز انسان کی محبت سے لبریز ہو اور فرائض کی انجام دہی میں ہمارا ارادہ مستحکم ہو اور بھلائی اور خیر کے کرنے میں ہم خدا کی مرضی کے تابع رہیں۔"

یہ ہیں وہ خیالات اور اعتقادات جو اس گروہ میں سے ایک فرد کے ہیں جن کی تحریرات مذہب کے بارے میں طعن و تشنیع سے پُر نظر آتی ہیں اور جو مذاہب کو فنا ہونے کی دھمکی دیتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بعض الفاظ اس آیۃ کریمہ کی پوری پوری تفسیر ہیں کہ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ اور بعض الفاظ مسلم اعتقادات کے بالکل موافق نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف اعتقادات میں ہی بلکہ عبادات جسمانی کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس گروہ کا ایک مشہور فلاسفر علامہ گیمون (Gameson) ایک مقام پر اس طرح رقمطراز ہے کہ "خارجی عبادت صرف اسوقت ناپسندیدہ ہوتی ہے جبکہ وہ مقصود بالذات ہو۔ لیکن اگر وہ انسانی نفس کے احساسات شریفانہ کو بیدار کرنے اور ان کو تقویت دینے کا ذریعہ ہو تو اس کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔"

یہاں پر نامناسب نہ ہوگا اگر ہم چند غیر مسلم اقوام کے مشہور لوگوں کے اقوال جو

قرآن مجید کے متعلق تحریراً یا تقریراً بیان کئے گئے ہیں بیان کردیں۔ چنانچہ فرانس کا ڈاکٹر موریس لکھتا ہے کہ قرآن شریف کی سب سے بڑی تعریف اس کی فصاحت وبلاغت ہے۔ مقاصد کی خوبی اور مطالب کی خوش اسلوبی کے اعتبار سے قرآن کو تمام آسمانی کتابوں پر فوقیت ہے۔ مسٹر لڈلف کریل کرصاحب لکھتے ہیں کہ قرآن میں عقائد واخلاق کا مکمل ضابطہ وقانون موجود ہے۔ وسیع جمہوریت۔ رُشد وہدایت۔ انصاف وعدالت فوجی تنظیم وتربیت اور مالیات اور غربا کی حمایت وترقی کے اعلیٰ آئین موجود ہیں۔ جارج سیل صاحب جو متعصب مترجم قران ہیں لکھتے ہیں کہ قرآن شریف بے شبہ عربی زبان کی سب سے بہتر اور سب سے مستند کتاب ہے۔ کسی انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا اور یہ مردوں کو زندہ کرنے سے زیادہ معجزہ ہے۔ ریورینڈ آر میکسویل کنگ اپنی تقریر دین اسلام میں کہتے ہیں کہ قرآن الہامات کا مجموعہ ہے۔ اس میں اسلام کے اصول وقوانین اور اخلاق کی تعلیم اور روزمرہ کے کام کے متعلق ہدایات ہیں۔ اس لحاظ سے اسلام کو عیسائیت پر فوقیت ہے کہ اس کی مذہبی تعلیم اور قانون علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ موسیو ادجین کلافل نامور فرانسیسی لکھتے ہیں کہ قرآن مذہبی قواعد اور احکام ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں سوشل احکام بھی موجود ہیں جو انسان کی زندگی کے لئے ہر حالت میں مفید ہیں۔ پروفیسر کارلائل صاحب لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک قرآن شریف میں خلوص اور مسیحائی کا وصف ہر پہلو سے موجود ہے اور سچ یہ ہے کہ اگر کوئی خوبی پیدا ہو سکتی ہے تو اسی سے ہو سکتی ہے۔ کاؤنٹ ہینری

ڈی کاسٹری اپنی کتاب الاسلام میں لکھتے ہیں کہ قرآن کو دیکھ کر عقل حیرت میں ہے کہ اس قسم کا کلام اس شخص کی زبان سے کیونکر ادا ہوا جو بالکل امی تھا۔ نامور مورخ ڈاکٹر گبن لکھتے ہیں کہ قرآن وحدانیت کا بڑا گواہ ہے ایک مواحد فلسفی اگر کوئی مذہب قبول کر سکتا ہے تو وہ اسلام ہی ہے غرض تمام جہان میں قرآن کی نظیر نہیں مل سکتی۔ موسیو سیدیو ایک مشہور فرانسیسی مصنف لکھتے ہیں "کہ اسلام کو جو لوگ وحشیانہ مذہب کہتے ہیں اُنہوں نے قرآن کی تعلیم کو نہیں دیکھا ہے جس کے اثر سے عربوں کی تمام بُری اور معیوب عادتوں کی کایا پلٹ ہو گئی" موسیو کارسٹن کار نے اخبار فگارو میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر زمین سے قرآن کی حکومت جاتی رہے تو دنیا کا امن و امان کبھی قائم نہیں رہ سکے گا۔ ایم ڈی بولف صاحب ایک جرمن ڈاکٹر لکھتے ہیں کہ قرآن نے صفائی۔ طہارت اور پاکبازی کی ایسی تعلیم دی کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو بیماریوں کے کیڑے سب کے سب ہلاک ہو جائیں چیمبرس انسائیکلو پیڈیا میں محمد نیزم کے زیر عنوان لکھا ہے کہ قرآن نے ظلم۔ جھوٹ۔ غرور انتقام۔ غیبت۔ طمع۔ فضول خرچی۔ حرام کاری۔ خیانت و بدگمانی کی بہت سخت برائی کی ہے اور یہی اس کی بڑی خوبی ہے سر ولیم میور صاحب جیسے متعصب انگریز نے لکھا ہے کہ قرآن نے فطرت اور کائنات کی دلیلوں سے خدا کو سب سے اعلیٰ ہستی ثابت کیا اور انسانوں کو خدا کی اطاعت اور شکر گذاری پر جھکا دیا۔ مسٹر عمانویل ڈی اتش لکھتے ہیں کہ "قرآن کی روشنی یورپ میں نمودار ہوئی جبکہ تاریکی محیط ہو رہی تھی اور اس سے

یونان کی مردہ عقل اور علم کو زندگی مل گئی"۔ مسٹر سروجنی نیڈو نے اپنی تقریر میں لندن میں کہا کہ قرآن شریف غیر مسلموں سے بے تعصبی اور رواداری سکھاتا ہے دنیا اس کے اصول کی پیروی سے خوش حال ہو سکتی ہے"۔

مسٹر ایچ ایس۔ لیڈر نے اپنے لیکچر میں ایک موقع پر کہا تھا کہ تعلیم قرآن سے فلسفہ وحکمت کا ظہور ہوا اور ایسی ترقی کی کہ اپنے عہد کی بڑی سے بڑی یوربین سلطنت کی تعلیم حکمت سے بڑھ گیا۔ مسٹر ای۔ ڈی ملارسن نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام کی قوت وطاقت قرآن میں ہے۔ قرآن قانون اساسی ہے اور حقوق کی دستاویز ہے۔ ایک مشہور جرمنی فلاسفر جان جاک لیک لکھتا ہے کہ جب منکر پیغمبر کی زبان سے قرآن سنتے تھے تو بیتاب ہو کر سجدے میں گر پڑتے تھے اور مسلمان ہو جاتے تھے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز ایک مشہور افسانہ نویس لکھتے ہیں کہ قرآن نے مسلمانوں کو مواخات کی بندھن میں باندھ رکھا ہے جو نسل۔ رنگ اور زبانوں کے فرق کی پابند نہیں ہے۔" میجر لیونارڈ لکھتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم بہترین ہے اور انسانی دماغوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ لندن کا اخبار نیر ایسٹ (Near East) لکھتا ہے کہ اگر ہم قرآن کی عظمت وفضیلت اور حسن وخوبی سے انکار کریں تو ہم عقل و دانش سے بیگانہ ہونگے۔ سر ایڈورڈ ڈھنس سی آئی ای لکھتے ہیں کہ قرآن شریف اس کا مستحق ہے کہ یورپ کے گوشہ گوشہ میں پڑھا جائے۔

اکثر یہ اعتقادات مذہب اسلام کے آفتاب کی ایک نامعلوم شعاع اور اس

کے بحر ذخار کا ایک اقل قلیل قطرہ ہیں لیکن اس نظریہ کی ضرور تائید کرتے ہیں کہ حقایق کے ادراک میں دنیا جسقدر ترقی کرتی جائیگی۔ اسی قدر اس پر رموز مذہب اسلام کھُلتے جائیں گے۔ اور اسلام کے اصول سے قریب تر ہوتی جائیگی۔

ہر وہ شخص جو تواریخ اقوام پر تدبیر و فکر کے ساتھ غور کریگا۔ اور ان کے مندرجہ واقعات کو بغور مطالعہ کریگا اس کو معلوم ہو جائیگا کہ تمام وہ اقوام جو زمانہ سلف میں مہذب اور متمدن طبقوں میں شمار کی جاتی تھیں۔ وہ در اصل کسقدر تمدن کے اصول سے دور تھیں۔ اس کو ایسے خوفناک اور درد انگیز حادثات نظر آئیں گے جن سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسکو بے شمار خوں ریز لڑائیوں تمدنی فتنہ و فساد۔ خاندانی مصائب و آلام اور اخلاق ذمیمہ کا صحیح اندازہ ہو جائیگا۔ ان اقوام نے دیگر ابنائے جنس کو وہ ناقابل تلافی نقصان عظیم پہنچائے ہیں جن کی مثال ملنا مشکل ہے اس کے استدلال میں ہم صرف دو عظیم الشان سلطنتوں کو پیش کرتے ہیں جو آغاز اسلام کے زمانہ میں تمدن کے بہترین طبقہ میں شمار کیجاتی تھیں اور دنیا کی دوسری قومیں ان کی شوکت و سطوت سے لرزتی تھیں ان کے حالات ایک غیر شخص کے الفاظ میں اس طرح درج ہیں گویا کہ وہ ایک مورخانہ حیثیت سے ان کے اخلاق اور طرز معاشرت کا خاکہ کھینچتا ہے چنانچہ علامہ لارڈس لکھتا ہے کہ "رومانیوں کے نظام سلطنت کیا تھے؟ وہ نظامات بالکل وحشت اور سراسر فسادات تھے جو قوانین کی صورت میں نافذ تھے۔ روما کے اخلاقی خصائل مثلاً شجاعت۔

فکر و تدبیر دور اندیشی اور قومی اخلاص بعینہٖ ایسے تھے جو چوروں اور رہزنوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی طینت وحشت کا لباس پہنے ہوئے تھی جس میں سوائے حرص و طمع اور افرادِ غیر کے ساتھ عداوت اور حسد کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ انسانی شفقت اور انسیت کی حالت زبوں تھی۔ روما کی عظمت اور فضیلت میں وہ اعمال تھے جو بذریعہ تازیانہ اور تلوار کے انجام دیئے جاتے تھے اسیرانِ جنگ کو عذاب اور قید کے احکامات صادر کیے جاتے تھے۔ بچوں اور بڈھوں سے فتح و نصرت کی گاڑیاں کھنچوائی جاتی تھیں ....، یہ روئے زمین کی سب سے عظیم الشان قوم کی تمدنی ترقی تھی جس پر علمائے سلف کو فخر ہے۔ جہاں ایک طرف فاتحان قوم اپنے مفتوح افراد کو فاتحانہ جذبات سے موثر ہو کر اپنی گاڑیاں کھنچوانے کی سزا دیتے نظر آتے ہیں وہاں دوسری طرف فتح مکہ میں فاتح اعظم اپنے ان تمام جانی دشمنوں کو جن کے نتیجہ ظلم سے جسمانی اور روحانی سخت ترین تکالیف اٹھائے زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا۔ بشارت صلح و امن، دیتا نظر آتا ہے۔ اور اپنے اخلاق کریمانہ اور تمدن اسلامی کا ان الفاظ میں نمونہ پیش کرتا ہے کہ "جو شخص ہتیار ڈالدیگا یا ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائیگا یا جو مسجد حرم میں داخل ہو جائیگا اس کو امن دیدی جائیگی۔" یہ وہ وقت تھا جبکہ اسلام فتح و نصرت کا تاج سر پر رکھے ہوئے اس شہر میں داخل ہوا تھا جہاں وہ کچھ ہی زمانہ پہلے دردناک مصائب کا شکار تھا اور وہ بھی اس شان و شوکت کیساتھ کہ مخالفین تاب مقاومت نہ لا سکے اور سب نے

عاجز ہو کر ہتیار ڈالدیئے تھے۔ اگر فاتح چاہتا تو اپنے دشمنوں کو تہ تیغ کر دیتا۔ سخت سے سخت ایذا میں وہ لوگ مبتلا کئے جا سکتے تھے لیکن وہاں نفسانی جذبات اور انتقامی احساسات کی بجائے انسانی ہمدردی اور تمدنی حسن سلوک کا مجسمہ کارفرما تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مقام ذی طوی میں پہنچے تو سب سے پہلے جو کام کیا وہ سجدہ شکر تھا۔ چنانچہ سربسجود ہو کر درگاہ الٰہی میں فرمایا کہ "ایک وہ وقت تھا جبکہ میں پوشیدہ طور پر اپنی جان بچا کر بھاگا تھا اسی سے دو سال قبل عمرہ کرنے آیا لیکن مخالفین نے داخل نہو نے دیا تھا اب یہ وقت ہے کہ میں صرف تیری قدرت کاملہ سے اسقدر شان و شوکت اور عزت و حشمت کے ساتھ اس شہر میں پھر فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوتا ہوں" اس موقع پر قابل غور یہ امر ہے کہ باوجود فتح و نصرت سب سے پہلے جو کام ہادی اسلام نے کیا وہ اس خدائے عزوجل کا شکر تھا جس کی بدولت یہ فتح حاصل ہوئی تھی۔ اور ایسے وقت میں بھی انہوں نے یاد الٰہی کو مقدم خیال فرمایا۔ جب مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو یہ شان تھی کہ سب سے پہلے چار سو بنی غفار تھے۔ پھر ایک ہزار تین سو قبیلہ مزینہ کے سوار اور سات سو اسلم کے سوار۔ ایک ہزار چار سو خاندان جُہینہ کے اور ایک کثیر تعداد قبیلہ خثیم قیس اور اسد کے لوگوں کی علم نصرت بلند کئے تکبیر و تہلیل کہتے ہوئے تھے۔ سب سے بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو اسی جماعت کے ساتھ تھے جنکا تمام لباس سبز تھا اور وہ سب کے سب لباس جنگ سے مزین تھے۔ اس شان و شوکت کو دیکھکر ابو سفیان

نے حضرت عباس سے کہا کہ اب تو میرا بھتیجہ بادشاہ ہو گیا ہے لیکن اُنہوں نے جواب دیا کہ یہ شان بادشاہت نہیں ہے بلکہ یہ شان نبوت ہے جب ہر طرح اسلام کا تسلّط ہو گیا تو آپ نے مفتوح قوم سے دریافت فرمایا کہ "تم کو میری بابتہ کیا خیال ہے؟ یعنی میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرونگا"؟ سب آپ کے اخلاق حمیدہ سے بخوبی واقف تھے گو ان کو اپنے جرائم کا بخوبی اندازہ تھا لیکن سب نے یہ عرض کیا کہ آپ خود کریم ابن کریم ہیں۔ یہ الفاظ سُنکر آپ نے فرمایا کہ "جاؤ میں نے سب کو آزاد کر دیا اور سب کی جاں بخشی کر دی" یہ تھا وہ خلق جس کی بدولت اسلام میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ کیا دنیا کی کوئی تاریخ ایسی نظیر پیش کر سکتی ہے؟ کیا دنیا کی متمدن سے متمدن اقوام میں سے کوئی قوم بھی یہ برتاؤ کر سکتی تھی جو نبی کریم نے اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ کیا؟ ہر گز نہیں ہر گز نہیں۔ تمام وہ صحابی جن کے اعزا و اقارب کفار مکہ کے ہاتھوں عذاب میں مبتلا ہوئے تھے یا قتل کیئے گئے اب برسر اقتدار تھے اور جائز طور پر بخوبی بدلہ لے سکتے تھے لیکن مذہبی اخلاق نے ان کو وہ تعلیم دی تھی جس کا عملی نمونہ اُنہوں نے اس موقع پر پیش کر دیا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ فمن عفی له من اخیه شئٌ فاتباعٌ بالمعروف و اداءٌ الیه باحسان پر کس طرح عامل ہوتے ہیں۔

تمام وہ گروہ انسانی جو اس مسکونۂ کرۂ ارض پر زیست سہ گانہ کے جزر و مد میں مصروف نظر آتے ہیں ان کی حالات زندگی پر ایک سطحی نظر یہ ثابت کر دیتی ہے کہ

کہ اس زندگی کے جدال وقتال میں وہی قوم سب سے زیادہ فائز المرام ہوگی جن کی اجتماعی قوت ان افراد سے وابستہ ہوگی جو اپنی ذاتی محنت وسعی اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں مشغول رہتے ہیں اور سستی اور کاہلی سے نفرت کرتے ہیں۔

اس اصول پر یہ کہنا کہ محنت وکوشش منجملہ ان اصول کے ہیں جو نوع انسانی کی افراد کو متمدن اور مہذب بناتے ہیں بالکل درست ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ علامہ ویرتش اور اس کے ہم خیال دیگر فلسفی مذاہب پر لعن وطعن کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ چیز جو انسانی ہستی کو کاہلی اور سستی کی طرف آمادہ کرتی ہے اور بالآخر اسکو قعر مذلت میں گرا کر چھوڑتی ہے وہ صرف مذہب ہے۔

فلاسفران مذکور کو دراصل ان اصول اسلامی کا علم نہیں ہے جو فی الحقیقت مذہب کی حیثیت سے انسان کو کاہلی اور تساہل سے نکالنے اور اس کو پابندی وقت کیساتھ تمام اپنے کاروبار زندگی میں تاعمر طبعی منہمک رہنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ مذہب اسلام نہ تو ایسے تقشف کی پابندی لازم کرتا ہے جس سے نفس انسانی تمام خواہشات اور رغبتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے اور نہ وہ اس قسم کے احکام نافذ کرتا ہے جو تمدنی صلاح وفلاح کے مانع ہوں اور معیشت کو اسقدر تنگ کردیں کہ اخلاقی تہذیب تک ناممکن ہوجائے بلکہ وہ معاشرتی۔ تعاونی اور تعاملی زندگی کو بہترین اصول کے ساتھ بسر کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ چنانچہ

اصلاح معیشت کی تعلیم حدیث نبوی کے ان الفاظ سے بخوبی ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے اپنی معیشت کی اصلاح کرنا ایک دانشمندانہ کام ہے اور جن امور سے تمہاری اصلاح ہوتی ہے ان کی جستجو کرنا حبِ دُنیا نہیں ہے،، ہم کو آغاز اسلام کے گروہ میں ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں جنہوں نے ان اصول پر عمل درآمد کیا اور جو اپنی معیشت کے لیے اسلامی نقطہ نظر سے صنعت و حرفت یا کسب حلال کو اختیار کرنا اپنا فخر سمجھتے تھے اور وہ دنیوی عقول کے ساتھ دین میں بھی ہمیشہ کامل ہوتے ہیں چنانچہ یہ تاریخی واقعہ مشہور ہے کہ جس وقت ہرقل بادشاہ روم نے سفیر اسلام سے حضرت عمرؓ کی بابتہ سوال کیا تھا کہ وہ کیسے شخص ہیں تو اس نے جواب دیا کہ لَا یَخْدَعُ وَلَا یُخْدَعُ یعنی نہ وہ خود کسی کو دھوکہ فریب دیتے ہیں اور نہ ان کو ہی کوئی شخص دھوکہ دیسکتا ہے۔ ہرقل نے کہا کہ اگر وہ ایسے ہیں تو ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا کہ جس میں دین اور عقل دونوں جمع ہوں اس کی قوت کا مقابلہ ممکن نہیں ہوتا۔

قوت عمل کے متعلق ہم کو اسلامی تاریخ وضح طور پر بتاتی ہے کہ تقریبًا تمام صحابہ کرام تجارت پیشہ تھے اور اکثر ائمہ دین بکریاں اور اونٹ چرا کر اپنی روزی پیدا کرتے تھے تواریخ کی ورق گردانی اس کو صاف ظاہر کر دیتی ہے کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے معززین بری اور بحری تجارتوں میں مصروف تھے اور اپنے باغوں میں اپنے ہاتھ سے کاروبار کرتے تھے۔ علمائے سلف میں جن حضرات نے اپنی معاش قوت بازو سے حاصل کی ہے ان کا رجحان خاطر بھی اکثر اسی مقدس

پیشہ کی طرف رہا ہے۔

چنانچہ حضرت سالم بن عبداللہ۔ حضرت سماکؒ بازار میں لین دین کا کام کیا کرتے تھے۔ امام یونس بن عبید داؤد ابو ہند اور امام ابو حنیفہ کی ریشمین کپڑوں کی تجارت تھی۔ امام ابن جوزی تانبا فروخت کرتے تھے اور حافظ حدیث ابن رومیہ عطار کی دوکان رکھتے تھے۔ ابو یعقوب لکڑی کا کام کرتے تھے اور محمد بن سلمان کا ذریعہ معاش گھوڑوں کی خرید و فروخت تھی۔ بعض وہ بزرگانِ دین تھے جو صرف حرفت کو اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوئے تھے۔ منجملہ ان کے ابو الفضل مہندس دمشقی مشہور طبیب برھمی کا کام کرتے تھے اور اپنے فن میں ماہر تھے چنانچہ شفاخانہ شاہی کے دروازے اکثر ان ہی کے ہاتھ کے بنے ہوئے تھے۔ جامع مسجد دمشق کی گھڑیوں کی مرمت انہیں کے ذمہ تھی جس کی بابت ان کو تنخواہ ملتی تھی۔ ابن طاہر امام ابو سعید نحوی۔ ابن الہیثم۔ طبیب نامور اور امام ابن الخاصبہ اپنے دست و بازو سے روٹی کماتے تھے اور اجرت پر کتابت کرتے تھے۔ امام ابو سعید نحوی باوجود عہدہ قضا پر مامور ہونے کے اپنا گذر صرف کتابت پر کرتے تھے۔ صرف دس ورق یومیہ لکھا کرتے تھے اور ان کی ہی اجرت پر قناعت کرتے تھے۔

ابن الہیثم جو فن طب میں کامل تھے اور بہت معزز عہدہ پر سرفراز تھے ایک سال میں صرف تین کتابیں۔ مجسطی۔ متوسطات۔ اور اقلیدس لکھا کرتے تھے جس کی اجرت ان کو ڈیڑھ سو اشرفی ملتی تھیں۔ اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ یہ چند

مثالیں تو اس زمانہ کی ہیں جبکہ اسلامی تمدن اسلامی تہذیب وشائستگی اور اس کے قوانین وضوابط کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ لیکن اس قسم کی مثالیں ہر زمانہ میں ملتی چلی آئی ہیں۔ چنانچہ اس آخری دور میں جو پستی کی حالت میں تھا ہندوستان میں ہم کو عالمگیر اورنگ زیب کی سوانح ان واقعات سے پُر نظر آتی ہیں۔ ایسا زبردست بادشاہ جس کے دبدبہ شاہی سے تمام ریاستیں ڈرتی تھیں اور جس کے قبضہ وقدرت میں تمام شاہان مغلیہ کا ذخیرہ تھا۔ اپنی معاش کتابت قرآن سے مہیا کرتا تھا۔ کیا باوجود اسقدر صریح تواریخی واقعات کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب اسلام کاہلی اور سستی کی طرف۔ رغبت دلاتا ہے۔

اسلام نہ صرف، دنیوی کاموں کی طرف رغبت دلاتا ہے بلکہ وہ اخروی کاموں کے لیے بھی یکساں تحریص دلاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت نے فرمایا کہ "تم دُنیا کے کام اس طرح کرو گویا کہ تم ہمیشہ زندہ رہو گے اور آخرت کے کام اس طرح انجام دو گویا کہ تم کل ہی مر جاؤ گے" کیا ان احکام سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ دنیوی کاروبار عین مرضی خدا ہے؟ دنیا ومافیہا سے دست بردار ہو کر ہمہ تن ریاضت وعبادات میں مصروف ہو جانے کا نام دین یا مذہب نہیں ہے۔ جن اقوام نے دین نافہمی سے صرف عبادت الٰہی کو اپنا مقصد قرار دیدیا ہے اور راہبانہ زندگی بسر کرنے لگے وہ پورے طور پر مذہب کے پابند نہ رہ سکے چونکہ بنی نوع انسان کے قیام کا انحصار بھی تنازع البقا پر ہے جس کو Struggle

far Excis tance کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جو قوم اس دنیوی کاروبار میں دیگر ہم عصر اقوام سے اپنے حقوق کے حصول میں پیچھے رہجائیگی۔ اس اصول پر ایک نہ ایک روز ضرور فنا ہو جائے گی اور دوسروں کے لیے عبرت آموز سبق ہوجائیگی ورنہ اس کے ذلیل اور پست ہونے میں تو کوئی شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔

مذہب اسلام چونکہ انسانی ترقی کا آخری دور ہے اس لئے اس نے انسان کی جسمانی۔ اخلاقی اور روحانی ترقیات کے اصول کامل طور پر بتائے ہیں۔ انسان اگر ذرا غور و تامل سے کام لے تو معلوم ہوگا کہ وہ نہ تو صرف اس دنیوی معیشت اور یہاں کے آرام و آسایش کے لیے ہی پیدا کیا گیا اور نہ وہ آخرت کے کام دنیا میں زیست سہ گانہ راحت کے ساتھ بسر کئے بغیر پورے طور پر انجام دیسکتا ہے گویا بالفاظ دیگر غایت تخلیق اشرف المخلوقات نہ تو محض دنیوی تعیش ہے اور نہ صرف اُخروی تقشف بلکہ تدین اور اسلامی اصول پر پورے طور پر کاربند ہو کر تنازع البقا کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے زاد آخرت جمع کرنے کا نام ہے۔ چونکہ زیست سہ گانہ کی ضرورت انسان کو کسب دولت پر مجبور کرتی ہے اور وہ بھی اس ضرورت سے کہ اوس نے نوع انسان کو افضل ترین عبادت بنایا ہے اور یہ امر ارشادات نبوی کے ان الفاظ سے واضح ہے کہ "تمام اعمال میں افضل کسب حلال ہے" اور نیز یہ کہ "حلال مال کا طلب کرنا

ہر مسلم پر فرض ہے" یہ اور اس مضمون کی بہت سی احادیث ہیں جن سے کسب مال کی تاکید ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ خلفائے راشدین اور ائمہ دین کے واقعات ہی اس کو بیّن طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ یہ حضرات سب کسب مال حلال طور پر اپنے دست و بازو سے پیدا کرتے تھے جیسا کہ امثال متذکرہ بالا سے معلوم ہوا ہوگا۔

توکل

اس ضمن میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مختصر بحث توکل کے متعلق بیان کر دیجائے تاکہ ان لوگوں کو جو ؎

"گفت پیغمبر بآواز بلند
بر توکل زانوئے اشتر بہ بند"

کے معنی و مطلب کو غلط سمجھکر مذہب کے نام سے تساہل اور کاہلی میں گرفتار ہو کر خود بھی تباہ ہوتے ہیں اور مذہب کو بھی بدنام کرتے ہیں واضح ہو جائے کہ اس کا مفہوم اصلی کیا ہے۔ توکل علی اللہ کے معنی تدابیر دنیوی سے روگردانی اور محض بخت و اتفاق کی امید موہوم کا انتظار کرنا نہیں ہیں اور نہ یہ کسی نص قرآنی یا حدیث نبوی سے ثابت ہے بلکہ ہر متنفس پر یہ فرض ہے کہ وہ کسب دولت یا کسی چیز کے حصول کے لیے تمام جائز طرائق دنیوی اختیار کرے اور حتی المقدور اس میں سعی بلیغ کرے اس کے بعد نتائج کو خداوند قدیر کی سپرد کر دے۔ اس وقت وہ یہ کہنے کا مستحق ہوگا کہ ؎

ما کار خویش را بخداوند کارساز
بسپردہ ایم تا کرم او چہا کند

لیکن اگر محض تقدیر کے خیال پر دینوی تدبیر ترک کر دی جائے اور محض کاہلی اور سستی کو توکل کا مرادف تصور کر لیا جائے تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص تشنہ لب کسی کنویں پر محض اس امید پر خاموش جا بیٹھے کہ اس میں کا پانی خود بخود اڑ کر اس کی پیاس بجھا دیگا - اگر بالفرض کوئی راہگیر اپنے ذاتی قیافہ و قیاس کو کام میں لاکر اس کی تمام تدابیر خود انجام دے کر اس کو پانی پلا بھی دے تو بھی اس کے معنی توکل کے ہرگز نہیں ہو سکتے بلکہ اس کو محض اتفاق سے تعبیر کیا جائے گا - بعض گروہ علما اس بخت و اتفاق کی بنا پر یہ سلسلہ رہبانیت توکل کو جائز قرار دیتے ہیں اور مذہب اسلام کو دوسرے مذاہب کے لیے ہدف ملامت بناتے ہیں - یہ دراصل ان کی غلطی ہے جو مذہب کو ایسا خیال کرتے ہیں - مذہب تو صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ ہر معاملہ میں خواہ وہ دنیوی ہو یا اُخروی ہمت اور پیش قدمی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے اور کاہلی اور گمنامی محرومی اور فقر و فاقہ کا سبب ہوتا ہے - چنانچہ ایک موقع پر حدیث شریف میں وارد ہے کہ "دلیر تاجر کو رزق ملتا ہے اور کاہل تاجر محروم رہتا ہے"، اور بدیہی بھی یہی امر معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص کسبِ رزق کے لیے مقررہ اصول فطرۃ کے مطابق عمل درآمد نہ کریگا وہ اس کے حصول کا مستحق ہی نہیں ہو سکتا - کیونکہ خود قرآن مجید میں آیا ہے کہ "وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا" یعنی خداوند تعالےٰ کے تمام امور ایک طریقہ مقررہ کے اصول پر منضبط ہیں اور کبھی ان کے خلاف ہونا نہیں پایا جاتا -

قناعت

اسی طرح قناعت کے بارے میں غلطی کی جاتی ہے دراصل قناعت یہ ہے کہ ہماری محنت اور وسائل سے جس قدر ہم کو مل سکے اسی پر اکتفا کریں اور ناجائز وسائل سے دوسرے لوگوں کے حقوق کے حصول کی کوشش نکریں۔ نہ یہ کہ جو ہماری محنت اور سعی کے صلہ میں ہم کو ملے اسی بھی چھوڑ دیں اور آمدنی کے جائز وسائل سے متمتع نہوں یا صحت اور فرصت کے لحاظ سے محنت اور وقت اکتساب کمال میں صرف نکریں یہ نہ قناعت ہے اور نہ پرہیز گاری کہ باوجود قدرت اور جواز کے کوئی شخص اکتساب معاش میں غفلت کرے اور اپنے آپ کو یا اپنے عزیز و اقارب کو تکلیف میں مبتلا کرے یا دوسروں کی خیرات پر گذارہ کرے۔ اگر وہ کثیر دولت سے مستغنی ہے اور اس کے مایحتاج سے زیادہ اس کے پاس موجود ہے تو بھی اکتساب سے باز نہیں رہنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں جب ذاتی ضروریات سے زیادہ ہوتا ہے تو رفاہِ عام اور خیر خواہی خلائق کے کام کر سکتا ہے۔ اپنے ابنائے جنس اور اپنی قوم کو فائدہ پہنچا سکتا ہے جس سے وہ عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہوگا۔

یہ ہیں وہ مذہبی اصول جن کی نسبت مشاہیر علما اور فلاسفران الٰہیات یہ رائے رکھتے ہیں کہ مذہب اس کا نام ہے کہ تم سیاسی زندگی کو خیر باد کہو اور تمام دنیوی کار و بار کو مثل ایک لغو اور باطل چیز کے ترک کردو۔" ان اصول اسلامی کا غور سے مطالعہ کرنے والا اور نظرِ انصاف سے دیکھنے والا کسی طرح پر بھی یہ استنباط نہیں کر سکتا۔

اس کو بجز ذہانت طبعی اور خبث باطنی کیا کہا جا سکتا ہے۔

اب ہم ان تمدنی فرائض کو بیان کرتے ہیں جو ایک مسلمان پر بہ حیثیت مسلم مذہب کی طرف سے فرض کیے گئے ہیں اور جو تعامل اور تعاون کے اصول پر پورے طور پر حادی اور زیست سہ گانہ کے جزو لاینفک ہیں تاکہ فلسفہ کے سرگرد ہوں اور نوع انسان کے درد مندوں کو یہ ثابت ہو جائے کہ وہ تمام مسائل جن پر انیسویں اور بیسویں صدی کے علمائے یورپ فخر کرتے ہیں دراصل اسی کی صدائے بازگشت ہیں جو چودہ سو سال پہلے مکہ اور مدینہ کی گھاٹیوں میں گونج رہی تھی۔

انسان اس دنیائے فانی میں ناقابل تغیر تعلقات اور مضبوط و مستحکم قوانین و ضوابط کی مسلسل کڑیوں میں جکڑا ہوا ہے ان تعلقات میں سے کچھ تو وہ ہیں جن کا تعلق صرف خدا سے ہے کچھ ایسے ہیں جو اس کی اپنی ذات سے وابستہ ہیں۔ کچھ اعزہ واقارب سے متعلق ہیں اور بعض کا تعلق ابنائے جنس اور عامۃ الناس سے ہوتا ہی۔ یہی وہ تعلقات ہیں جن کی پورے طور پر انجام دہی تمدنی زندگی کا اصلی معیار اور انسانی فرائض کی بجا آوری ہے۔ اب وہ طاقت جو انسان کے ان تعلقات کو مناسب طور پر برتنے کی ہدایت کرتی ہی وہ نفس لوامہ ضمیر یا کانشنس کے نام سے موسوم کیجاتی ہی وہ بجا طور پر انسانی فرائض کی بجا آوری پر اطمینان و مسرت غلطیوں پر تاسف و نفرت اور لغزشوں پر تنبیہ و حسرت کا اظہار کرتی ہے۔ کانشنس کا یہ کام نہیں ہی کہ وہ ان فرائض کی انجام دہی کے لیے بھی انسان کو منع کرے جن کا اس کو علم

نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف ان احکام کے متعلق بتاتا ہے جو انسان پر بذریعہ مذہبی کتب فرض ہیں اور علمی وسائل کے ذریعہ سے ان کا اس کو علم ہے۔ اب دیکھنا یہ ہی کہ ان تعلقات کی بابت مذہب اسلام میں کہاں تک قوانین منضبط ہیں اگر بنظر غور و انصاف دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ایسا مکمل قانون ہے جس میں تمام فرائض دینی و دنیوی موجود ہیں اور انسان کے وقت پیدائش سے اس کی زندگی کے آخری لمحات تک کا پورا پروگرام مندرج ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق الناس کا مکمل طرز عمل موجود ہے۔ معاملات و معاشرت۔ تجارت و زراعت شجاعت و سخاوت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے علم و حکمت، تواضع و حمیت، صبر و قناعت، صدق و عدالت پر مفصل بحث ہے۔ غرض ہر قسم کے انسانی خصائل و جذبات کے قواعد منضبط ہیں اور جو ان سے واقف ہیں ان کا کانشنس ان کو صحیح طور پر ہدایت کرتا ہے

اب جبکہ انسان کا مدنی الطبع ہونا یعنی زلیست سہ گانہ کے قیام کے لیئے ان کی یکجائی ضروری اور لازمی جزو تمدن کا قرار پا گئی ہے تو اس کے لیے زیادہ ضروری چیز محبت یا اخوت ہے جس کے بغیر وہ مربوط شیرازہ ایک آن بھی قایم نہیں رہ سکتا ہر مسلمان کا بہ حیثیت مسلم یہ فرض ہی کہ وہ اپنے تمام ہم مذاہب لوگوں کو بلا اختلاف حیثیت، رنگ، عادت و خصلت خالص اس نظر سے دیکھے جو حقیقی اخوت اور محبت کا اقتضا ہے۔ محض اس بنا پر کہ وہ مسلم ہیں خواہ چینی ہوں یا تاتاری،

ہندی ہوں یا مصری، یورپین ہوں یا افریقی، امریکن ہوں یا سندھی ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ مسلمانوں کے باہمی برادرانہ تعلقات اس حدیث سے ثابت ہیں کہ تم "ہرگز جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک کہ مومن نہ ہو۔ اور تم ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ باہم محبت نہ کرو" یہ اور صدہا احادیث ہیں جن سے قومی سچی محبت کی دلیل ملتی ہے اور جو قومی سعادت کا اصل اصول اور تمدنی شائستگی کا سرچشمہ ہیں۔ یہی وہ اخوت قومی تھی جس نے مہاجرین مکہ کو جو محض غریب الوطن مسافر تھے شرفائے مدینہ کا حقیقی بھائی بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے تجارتی کاروبار اور موروثی املاک تک میں ان کا حصہ قائم ہو گیا تھا۔ اور یہی وہ سچی مساوات ہے جو شبانہ روز میں پانچ وقت مسجد کی ایک صف میں بادشاہ اور رعایا کو دوش بدوش بلا اختلاف حیثیت دکھاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علمائے یورپ کے اس خیال پر بھی کچھ روشنی ڈالدی جائے کہ "اسلام غلاموں کو حیوان خیال کرتا ہے اور ان کی خرید و فروخت کے لیے بازار قائم کرنے کو ایک امر مستحب قرار دیتا ہے" چونکہ اس خیال سے ہماری اس مسلم مساوات کی ایک حد تک تردید ہوتی معلوم ہوتی ہے اس لیے اگر اس زمانہ کی تواریخ پر ایک سطحی نظر بھی ڈالی جائے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ وہ غلامی جس کو ہم صدی کے حامیانِ حریت بنظر نوعیت دیکھتے ہیں موجودہ زمانہ کی سرداری اور آزادی سے

بدرجہا بہتر تھی۔ جو حقوق مذہباً ایک غلام کے اس کے مالک کے ذمہ عائد ہوتے ہیں وہ اس کو مالک کے بالکل برابر بنا دیتے ہیں۔ وہ خاندان کا ایک فرد اور شریک ہوتا ہے اور اس میں وہی اخوت کا حق باقی رہتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جن کو خدا نے تمہارے ماتحت کیا ہے لہذا کسی بڑے سے بڑے آدمی کو کسی ادنیٰ سے مسلمان حبشی غلام پر فخر کرنیکا کوئی حق نہیں ہے" تاریخی واقعات اس پر دال ہیں کہ صحابہ کبار نے کس طرح اس کو عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جب اپنے غلاموں کے ساتھ باہر نکلتے تھے تو بہ سبب یکساں لباس و پوشش اور برابر چلنے کے ایک اجنبی شخص کو آقا اور غلام میں تمیز تک نہو سکتی تھی۔ اسی طرح کا برتاؤ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تاریخ میں مذکور ہے کہ اُنہوں نے غلام کے ساتھ بازار سے دو کپڑے خریدے جس میں ایک دوسرے سے زیادہ قیمتی تھا۔ آپ نے بیش قیمت کپڑا تو اپنے غلام کو عطا فرما دیا اور کم قیمت اپنے واسطے رکھہ لیا۔ اس پر غلام نے عرض کیا کہ اس کپڑے کے مستحق تو زیادہ تر آپ ہیں نہ کہ میں۔ میں آپ کا ایک ادنیٰ خادم و غلام ہوں لیکن آپ نے جوابدیا کہ میں بڈھا ہو گیا ہوں لیکن تم ابھی جوان ہو، اس لیے تم ہی زیادہ مستحق ہو۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک جلیل القدر خلیفہ وقت تھے جن کے رعب شاہی سے بڑے بڑے اولوالعزم سلاطین کے تخت ڈرتے تھے لیکن حضرت

بلالؓ ایک حبشی النسل غلام کو سیدنا کے خطاب سے یاد فرماتے تھے۔ جب ان کا آخری وقت قریب ہوا اور خلافت کا معاملہ پیش ہوا اور جانشین کا سوال آیا تو آپ نے فرمایا کہ "اگر ابو حذیفہ کے غلام سالم زندہ ہوتے تو میں خلافت کو شوریٰ پر کبھی منحصر نہ کرتا"۔ ان چند واقعات سے اس زمانہ کی یا مسلمانوں کے غلاموں کی غلامی اور حُریت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تھی وہ غلامی جہاں ایک غلام جانشین تخت و تاج تک کا مستحق ہوتا تھا اور جہاں حضرت بلال حضرت سالم اور حضرت سلمان اسلامی سوسائٹی میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر سرفراز تھے۔ کیا وہ غلام آجکل کے آزادوں سے زیادہ معزز اور فخر روزگار نہ تھے؟

اس مساوات کی بنیاد جس پر مشاہیر زمانہ ہر قسم کے تمدنی صلاح و فلاح کا انحصار رکھتے ہیں دراصل سب سے اوّل اسلام میں قائم ہوئی اور اسی بنیاد پر اسلامی شان و شوکت عزت و حریت کا قصر مستحکم اسقدر جلد تعمیر ہوا کہ دیگر اقوام آجتک متحیر ہیں۔ وہ مساوات نہ صرف آپس میں ایک دوسرے مسلمان ہی کے درمیان تھی بلکہ ایک ادنیٰ غیر قوم کے فرد اور ایک مسلمان بادشاہ وقت میں بھی وہی برتاؤ اور انصاف ہوتا تھا جس پر تواریخ مشاہد ہیں۔ متعدد واقعات ایسے پیش آتے ہیں جن میں ایک معمولی شخص کے مقابلہ میں بادشاہ اپنے عزیز و اقارب تک کو شرعی سزا دیتے تھے اور تمام مقدمات میں بالکل مساوات کا برتاؤ ہوتا تھا۔ حاکم اور محکوم قوم کا رشتہ بہت نازک ہوتا ہے۔ ایک قوم کو برسرِ اقتدار ہو کر عدل و

انصاف پر قائم رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ رومیوں کے بیشمار واقعات ملتے ہیں کہ جہاں اپنے ہم مذہب کے ساتھ زیادہ رعایت ہوتی تھی دائرۃ المعارف میں ایک مقام پر اس طرح درج ہے کہ "روم میں سزائیں ایک ہی قسم کے جرائم میں مجرموں کی حالت اور حیثیت کے لحاظ سے مختلف دیجاتی تھیں" لیکن مسلم عدالتوں میں سزائیں بالکل عادلانہ ہوتی تھیں۔

اسلام نے جس طرح آپس میں ہم مذہبوں میں اخوت پیدا کی اسی طرح غیر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ بھی صلح و آشتی کی ہدایت کی ہے۔ اور ان کے لیے بھی جداگانہ قواعد منضبط کر دیئے ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح ایسے واقعات سے پر ہیں جن میں آپ یہود اور نصاریٰ کی شرکت فرماتے تھے۔ ان کے جنازوں کی مشایعت کرتے تھے ان کی دعوت اور مجالس میں شریک ہوتے تھے اور تمام وہ تمدنی معاملات قائم رکھتے تھے جن کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ پھر وہی مسلم جب کسی ایسے شہر میں فاتحانہ شان و شوکت کے ساتھ داخل ہوتے تھے جہاں کے باشندے اعتقاداً اور مذہباً مختلف ہوتے تھے تو ان لوگوں کو کافی آزادی دیتے تھے۔ مسجدوں کے سامنے گرجاؤں میں گھنٹے اور مندروں میں ناقوسوں کی اجازت دیجاتی تھی۔ اور اسلامی تمدنی اصول کی پیروی میں دوسرے مذاہب اور معتقدات کے اقوام جن کے ساتھ وہ سکونت اور تعلقات قائم رکھتے تھے وہ فیاضانہ سلوک کرتے تھے جس کی نظیر نوع

انسانی کی تاریخ میں تلاش وجستجو لاحاصل ہے۔ ان میں حسنِ معاشرت اس درجہ تھی
کہ فی زمانا دو حقیقی بھائیوں میں بھی ناممکن ہے۔ غرضکہ اسلام نے کوئی اصول
اور کوئی قاعدہ وقانون ایسا نہیں چھوڑا جو بہ حیثیت مذہب منضبط نہ ہو اور جس کو
صدر اسلام کے گروہ نے علمی جامہ پہنا کر اس کا اصلی فوٹو دنیا کے سامنے نہ
پیش کر دیا ہو۔ اس کے بعد خلفائے راشدین بنو امیہ اور بنو عباس نے بھی
اسی کا تتبع کیا اور اس گروہ کے دیگر شیوخ و اکابر نے جس طرح اپنی زندگیاں
گذاریں اور جس قدر ترقیاں علوم حاصل کرنے میں کیں اور صنعت و حرفت
کے ماہر ہوئے وہ سب آج افسانہ ہو کر فنا ہو چکے ہیں۔ اخلاف اپنے اسلاف
کے ان عظیم الشان کارناموں سے بالکل بے خبر ہیں اور تمام علوم مشرقیہ اور
عالمان شرقی جو کسی زمانہ میں تمدن کا سرچشمہ تھے اپنا کمال عروج دکھا کر علوم مغربیہ
کے افق میں غروب ہو چکے ہیں اور اب عالمان مغرب نے اس طرح ایک خوشنما
منظر عالم کے سامنے پیش کر دیا ہے جس طرح کہ آفتاب نظر فریب اپنی تمام
دن کی چمک دمک دکھا کر شام کو قریب الغروب افق پر ایک خوشگوار منظر پیش
کرتا ہے۔ کوتاہ بین اس کی فضا میں ایسے محو ہو جاتے ہیں کہ اس کے اصل منظر
کو فراموش کر دیتے ہیں اور اس ظلمت سے بے خبر ہو جاتے ہیں جس کا وہ پیش خیمہ ہے۔
علوم مغربی کی ظلمت نے ہماری چشم بینا پر ایک پردۂ تاریکی ڈال دیا ہے اور زمانہ
کے متعدد پردے اس طرح درمیان میں حائل ہو گئے ہیں کہ ہم ان واقعات سے

بالکل بے بہرہ ہیں اور اس آخری جھلک کو اپنا معیارِ اصلی تصور کرنے لگے ہیں۔

اس موقع پر اس زمانہ کے چند واقعات کا انکشاف نامناسب نہ ہوگا۔ جبکہ اسلامی تمدن عروج پر تھا تاکہ ان بزرگوں کی سوانح اور حالات سے ان کی ترقیات اور طرزِ معاشرت کا کچھ اندازہ ہو سکے اگرچہ اس کام کے لیے جداگانہ ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ لیکن بطور مشتے نمونہ از خروارے حسب ذیل واقعات پر ہم کفایت کرتے ہیں۔ ان پر نظر ڈالنے سے ہم کو اس کا بھی اندازہ ہو جائیگا کہ وہ لوگ علوم کے حصول میں کس قدر محنت شاقہ برداشت کرتے تھے اور کس قدر دور دراز ممالک کا سفر پاپیادہ طے کرتے تھے جبکہ وسائل سفر بالکل محدود تھے۔

امام مالک نے حضرت سعید بن المسیب تابعی سے روایت کی ہے کہ میں ایک ایک حدیث کی خاطر راتوں اور دنوں پاپیادہ چلا ہوں۔ امام دارمی نے طلب حدیث میں۔ حرمین۔ عراق۔ خراسان۔ شام اور مصر کا سفر طے کیا تھا۔ امام بخاری امام ابو حاتم اور امام بغوی نے ہزاروں میل کا سفر پیدل طے کیا اور ان تمام ممالک کی سیاحت کی جہاں جہاں بھی راویانِ حدیث کا پتہ چلا۔ ایک ایک حدیث کے لیے جو جو مصیبتیں برداشت کیں وہ قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ ایک ہی بزرگ حافظ ابن مصرح نے حدیث کی سماعت سعید بن الاعرابی سے مکہ مکرمہ میں کی ابن راشد سے دمشق میں۔ قاسم بن اصبع سے قرطبہ میں جواب کارڈوا کے نام سے اسپین میں موسوم ہے ابن سلیمان سے طرابلس میں۔ محمد سے مصر میں اور دیگر مشائخ سے۔ جذہ صنعا

اور بیت المقدس میں یہ بزرگ محض اپنے جوش عقیدت اور طالب علمانہ حوصلہ کے
ریل اور ہوائی جہاز پر سفر کرتے تھے ایک مادر زاد نابینا ابو العباس رازی کا
واقعہ درج ہے کہ گو وہ تمام مناظر قطرت اور سیاحی کے لطف سے محروم تھے
لیکن محض احادیث نبوی کی سماعت کے لیے اُنھوں نے بلخ بخارا۔ نیشاپور اور
بغداد کا سفر کیا اور حافظ حدیث ہوئے اس گروہ میں ہم کو خطیب تبریزی شارح
حماسہ کی نظیر بھی ملتی ہے کہ جب ان کو لغت کی کتابیں مصنفہ ابو المنصور
دستیاب ہوئیں تو ان کے مطالب سمجھنے کے لیے وہ ملک شام میں مقام معرہ کو
علامہ ابو العلا معری کی خدمت میں روانہ ہو گئے اور کتب کا پشتارہ اپنی پشت پر
لاد کر لے گئے جب وہاں پہنچے تو وہ کتابیں اس قدر پسینہ سے بھیگ گئیں تھیں
جیسے پانی میں ڈوب جاتی ہیں۔

فی زمانہ جو تعلق شاگرد اور اُستاد میں ہوتا ہے وہ محض تجارتی اصول پر
مبنی ہوتا ہے۔ لیکن علمائے سلف کے کارناموں سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے
کہ کسی خاص ماہر فن اُستاد کی شاگردی کے لیے لوگ سفر کے کس قدر مصائب و
آلام برداشت کرتے تھے اور کس درجہ عقیدتمندی سے حصول علم میں کوشاں
رہتے تھے۔ چنانچہ علامہ سید شریف کو بزمانہ طالب علمی یہ شوق ہوا کہ شرح مطالع
خود اس کے مصنف سے پڑھیں چنانچہ وہ ان کی خدمت میں خراسان سے سفر
کر کے ہرات گئے۔ لیکن وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ اس قدر ضعیف ہو گئے ہیں

کہ ان کے قوائے دماغی بالکل جواب دے چکے ہیں۔ اُنھوں نے ان کی عالی ہمتی کو دیکھ کر اپنے شاگرد مبارک شاہ کے پاس جانے کی ہدایت کی اس لیے وہ ھرات سے قاھرہ پہنچے اور اسی شوق علم میں خراسان سے مصر تک کا سفر پاپیادہ طے کیا۔ مبارک شاہ نے ان کو اپنی شاگردی میں قبول کیا اور بالآخر بلند پایہ کے عالم ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ چھاپہ خانہ کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ درسی کتب کا کتب خانوں یا بُک اسٹالوں سے باوجود صرفِ کثیر ملنا محال تھا۔ طلبا کو صرف پڑھنے ہی کا ایک کام نہ تھا بلکہ درسی کتابوں کی کتابت بھی ان کو خود اپنے ہاتھوں کرنا پڑتی تھی چنانچہ علامہ تفتازانی کی تصانیف جب روم میں رائج ہوئیں تو وہ اسقدر معدوم تھیں کہ علامہ شمس الدین کو علاوہ جمعہ اور سہ شنبہ کے مدارس میں دو شنبہ کی تعطیل کا اور اضافہ کرنا پڑا۔ جن ایام میں طلبا صرف کتابت ہیں وقت صرف کرتے تھے۔ حافظ ابن فراث نے جب انتقال کیا ہے تو ان کے پاس سے کتابوں کے اٹھارہ صندوق دستیاب ہوئے تھے جن میں اکثر و بیشتر کتب خود ان کے ہاتھ کی لکھی تھیں۔ سبط ابن جوزی سے منقول ہے کہ "میں نے اپنے دادا شیخ بن جوزی کو ممبر پر یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے اپنی ان انگلیوں سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں" جس شخص نے ڈھائی سو کتابیں تصنیف کر دی ہوں ان سے دو ہزار کتابوں کی کتابت کیا مشکل ہو سکتی ہے۔ انہیں کی بابت یہ مشہور ہے کہ جن قلموں سے اُنھوں نے احادیث لکھی تھیں ان کا تراشہ اتنا کثیر تھا کہ اس کے ایندھن

سے ان کے غسل میت کا پانی گرم کیا گیا تھا جس کام کے لیئے وہ شروع سے اس کو جمع کرتے رہے تھے۔ حضرت یحییٰ بن معین نے فرمایا ہی کہ میں نے اپنے ہاتھ سے چھ لاکھ احادیث لکھی ہیں۔ امام ابو اسامہ کوفی نے ایک سو دس برس کی عمر میں وفات پائی اور آخر عمر تک سلسلہ تحریر جاری رہا۔ اس زمانہ میں کتابت کی مہارت اسدرجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ابوسعود رومی جو قسطنطنیہ کے مفتی تھے ان کی بابت لکھا ہے کہ وہ ایک روز میں ہزار ہزار خطوط کا جواب خود لکھدیا کرتے تھے جن میں سے ایک دوسرے سے خوبی اسلوب اور حسنِ معنی میں زیادہ ہوتا تھا۔ کتابت میں اس درجہ تشغف تھا کہ حافظ حدیث حمیدی میورتی رات کو بوجہ گرمی پانی میں بیٹھکر لکھا کرتے تھے۔ درس و تدریس میں اس قدر انہماک ہوتا تھا کہ اس کے سامنے ہر چیز ہیچ معلوم ہوتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ان کا حافظہ ان کے اس کام میں بہت کچھ معین ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ امام دارقطنی اوائل عمر میں اسمٰعیل سفار کی مجلس املا میں موجود تھے۔ ان کے استاد تو ان کو املا لکھا رہے تھے اور یہ خود ایک کتاب کی نقل میں مصروف تھے۔ اس وقت کسی صاحب مجلس نے یہ اعتراض کیا تمہارا اسماع کس طرح قابل وثوق ہو سکتا ہی جبکہ تم نقل کتاب میں منہمک ہو ان کا جواب علامہ مذکور نے یہ دیا کہ سماع سماع میں بھی تو بہت فرق ہے اور پھر انہیں سے دریافت کیا کہ حضرات آپ تو ہمہ تن متوجہ ہیں یہ فرمایئے کہ اس وقت کس قدر احادیث بیان ہوئی ہیں چونکہ معترض صاحب

کو مجموعی تعداد یاد نہ تھی اس لیے مجبوراً خاموش ہونا پڑا لیکن امام صاحب موصوف نے فرمایا کہ اس وقت تک کل اٹھارہ احادیث املا کرائی گئی ہیں اور اس میں سے ہر ایک کا جداگانہ متن اور اس کی اسناد سب لفظ بہ لفظ بیان کر دیں اسی طرح ایک مرتبہ کا قصہ مذکور ہے کہ علی ابن الحسن بعد نماز عشا حضرت عبد اللہ بن المبارک کے ساتھ مسجد سے اٹھے مسجد کے دروازہ پر کسی حدیث کے بارہ میں مباحثہ شروع ہو گیا۔ اس قدر انہماک ہوا کہ فجر کی اذان ہو گئی اور دونوں صاحب مسجد میں واپس چلے گئے اور نماز فجر ادا کر کے اپنے مکانوں کو واپس گئے۔

یہ اور اس قسم کی اکثر مثالیں اس زمانے کے حالات پڑھنے سے ملتی ہیں جن سے اس زمانے کے طرز معاشرت اور علوم کے حصول کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس زمانے کے حالات کا کچھ اندازہ ایک طالب علم کی مختصر لائف سے بھی بخوبی ہو سکتا ہے جہاں علامہ اصیبعہ نے اپنے چچا رشید الدین کی بابتہ ایک موقع پر لکھا ہے کہ "انہوں نے سب سے پہلے قرآن شریف حفظ کیا اس کے بعد فنِ ریاضی میں تکمیل کی اس کے بعد طب شروع کی اور مصر میں تقریباً سو رسالہ طب جالینوس کے ازبر یاد کئے اور اس کے بعد شفا خانوں میں جا کر عملی دستگاہ حاصل کی اور اس سلسلہ میں فن کحالی یعنی آنکھوں کے متعلق تمام علوم کی تکمیل کی اور پھر جراحی میں مشق مہارت کے درجہ کو پہنچائی اس کے بعد ادب اور فلسفہ شیخ عبد اللطیف بغدادی سے حاصل کیا اور منطق اُستاد علوم صدر الدین صاحب

منطق بھی پڑھی اُنہوں نے نہ صرف اس پر اکتفا کیا بلکہ فن نجوم میں ابو محمد جعفری سے اور علوم موسیقی میں ابن دیجور سے کامل دستگاہ حاصل کی۔

یہ تمام علوم اُنہوں نے اپنی عمر کے بیسویں سال میں ختم کر لیے تھے۔ اس وقت وہ ملکِ شام میں اپنا مستقل مطب کرنیکی غرض سے اقامت گزیں ہوئے لیکن سلسلۂ درس کا برابر جاری رہا۔ وہ علاوہ دیگر زبانوں کے ترکی اور فارسی زبانوں سے بخوبی واقف تھے اور فارسی اشعار بھی کہتے تھے"۔ یہ تو ایک طالبعلم کی زندگی کی مختصر سرگذشت ہے لیکن اسی طرح کی اکثر مثالیں تواریخ سے ملتی ہیں جنہوں نے کوئی علم ایسا نہیں چھوڑا تھا جس میں پورے طور پر کمال نہ پیدا کر لیا ہو۔ قرطمہ کی بابت مشہور ہے کہ ان کی لائبریری کتابوں سے معمور تھی انہوں نے ایک بار کسی ملنے والے سے کہا کہ اس میں سے جو کتاب چاہو نکال کر مجھسے دریافت کر لو چنانچہ اُنہوں نے انکا امتحان لیا تو کوئی کتاب ایسی نہ ملی جو ازاول تا آخر ان کے نوک زبان نہو۔ حضرات اصمعی۔ ابو عبیدہ۔ ابو بکر نحوی۔ ابو حاتم رازی اور ابو زرعہ اپنی قوت حافظہ میں مشہور گزرے ہیں۔ ایک مقام پر مجدالدین فیروز آبادی لکھتے ہیں کہ "میرا یہ دستور تھا کہ میں جب تک دوسو سطور حفظ نکر لیتا تھا سوتا نہیں تھا ہم کو اس گروہ میں ایسی ہستیاں بھی نظر آتی ہیں جن کی طالب علمانہ زندگی ان کے آخری دم تک ساتھ رہی اور مطالعہ کا شوق اور انہماک ہی ان کی ہلاکت کا سبب ہوا اس کی مثال میں امام ادب ابو العباس ثعلب کی وفات حسرت آیات

پیش کی جاتی ہے۔ وہ ایک روز بعد فراغت نماز جمعہ اپنے مکان کو واپس جا رہے تھے کتاب کے مطالعہ کا شغف راستہ میں بھی بدستور جاری تھا گیا نوے سال کی عمر۔ ادھر ثقل سماعت ادھر کتاب میں محویت اتفاقاً راستہ میں ایک گھوڑے سے مڈبھیڑ ہو گئی اور اس کے صدمہ سے بیہوش ہو کر ایسے گرے کہ وہیں جان بحق ہو گئے۔

کتاب حماسہ جو آج کل ادبی دنیا میں مشہور و معروف کتاب مانی جاتی ہے اس کی تالیف اس انہماک اور شوق مطالعہ کی وجہ سے ہوئی ہے اس کا واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ ابو تمام طائی مولف حماسہ اور شاعر نامور دربار خراسان کے لیے عازم سفر ہوئے۔ جب مقام ہمدان پر پہنچے تو سردی کی کثرت اور برف باری کی زیادتی نے تمام راستے مسدود کر دیئے۔ مجبوراً ان کو وہاں چندے قیام کرنا پڑا۔ جن صاحب کے یہاں وہ مقیم تھے ان کی لائبریری کتب سے معمور تھی۔ انہوں نے وقت کو غنیمت جانا اور تمام شعرائے عرب کے مشہور دیوان نکال کر ایک مجموعہ تیار کیا اور اس کا نام الحماسہ رکھا۔

امام نحو یونس کی کل عمر اٹھارہ سال کی ہوئی ہے جس میں انہوں نے یہ مرتبہ پایا کہ فن نحو کے امام ہو گئے۔ انہیں کی بابت ابن خلکان ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "تمام عمر ان کی شادی نہیں ہوئی اور دم آخر تک پیش نظر بجز طلب علم اور مباحث علمیہ اور کچھ نہیں رہا"۔

ان میں سے اکثر تصانیف ایسے وقت کی ہیں جبکہ مصنف کو جان تک کے لالے پڑے تھے حاکم وقت کے ظلم سے ان کے جسم قید خانوں میں مقید تھے لیکن شوق علم توسن قلم پر پرواز کر رہا تھا۔ منجملہ ان کے ایک شیخ الرئیس تھے جنہوں نے ایک عطار کے گھر پناہ لی تھی اور اپنا دماغ تصنیف میں صرف کر رہے تھے اور اس طرح انہوں نے فن طبعیات اور الٰہیات ختم کر دیئے لیکن وہاں سے گرفتار ہو گئے تو پھر فردجان کے قلعہ کو بھیج دیئے گئے اور انہوں نے وہاں بھی اپنا سلسلہ تصنیف جاری رکھا اور کتاب الہدایات۔ رسالہ حیی ابن یقظان اور کتاب قلنج کی مکمل کتب تیار کیں۔ اسی طرح شمس الائمہ سرخسی نے ایک بلند پایہ کتاب علم اصول میں تصنیف کی اس کی تصنیف کا آغاز خوارزم کے قیدخانہ میں ہوا اور اختتام رہائی کے بعد فرغانہ میں ہوا۔

یہ تو وہ حضرات تھے جو علوم مشرقیہ کی فضائے آسمانی پر چاند اور ستارے تھے جن میں سے ہر ایک۔ زہرہ۔ مشتری۔ اور مریخ سے کم نہ تھا لیکن یہ فضائے آسمانی بے شمار ستاروں سے روشن تھا جن کی تعداد کا کچھ اندازہ واقعات ذیل سے ہو سکتا ہے۔ شہر بغداد میں ایک مرتبہ سلیمان بن حرب کے واسطے ایک بلند پلیٹ فارم تیار کیا گیا تھا جس پر وہ املائے حدیث کیا کرتے تھے اور اس میں امراء و رؤسا شریک ہوا کرتے تھے جب اس مجمع کا اندازہ کیا گیا تو چالیس ہزار آدمیوں کا تخمینہ ہوا۔ خلیفہ معتصم باللہ نے ایک مرتبہ اپنے محتسب کے ذریعہ سے

امام عاصم بن علی کی جماعت کا اندازہ کرایا تھا تو اس میں ایک لاکھ بیس ہزار کی تعداد تھی۔

تیسری صدی ہجری میں ایک ایک مجلس علمیہ میں دس دس ہزار دواتیں رکھی جاتی تھیں۔ امام بخاری کے صرف ایک شاگرد سے جن کا نام فریری تھا نوے ہزار لوگوں نے درس لیا تھا۔ مسلم بن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے ایک شہر بغداد میں آٹھ سو شیوخ سے فنِ حدیث حاصل کیا۔ اس کے علاوہ اور شہروں میں مختلف فنون کے جو اُستاد ہوں گے ان کا کوئی شمار بھی نہیں ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں تعلیم کا کیا حال تھا اور کس طرح کا ربط اُستاد اور شاگردوں میں قائم رہتا تھا۔ جب ایک شہر میں ایک فن کے آٹھ سو سے زیادہ اُستاد کامل ہوں تو وہاں کے شاگردوں اور تہذیب و تمدن کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر ان لوگوں کی جو عظمت و وقعت ان کے شاگردوں اور عوام کے دلوں میں ہوتی تھی وہ اس سے ظاہر ہے کہ امام ادب نضر بن شمیل جب بصرے سے خراسان کو جانے لگے تو تین ہزار شخص ان کی مشایعت میں شہر سے باہر تک گئے اور یہ گروہ صرف ان علما کا تھا جو علم لغت علم عروض اور علم حدیث میں ماہر تھے۔ کسی خاص اُستاد کا شاگرد ہونا فخر خیال کیا جاتا تھا اور اس سے محرومی پر عمر بھر کفِ افسوس ملا جاتا تھا۔

چنانچہ امام ابوالعاس کے بارے میں لکھا ہے کہ اُنہوں نے اوائل عمر میں

بزمانہ طالب علمی اپنی والدہ سے امام قتیبہ کی خدمت میں شرف شاگردی حاصل کرنے کی اجازت چاہی لیکن انہوں نے باقتضائے محبت اپنے بیٹے کو اسقدر دور دراز سفر پر بھیجنا اور اپنی آغوش محبت سے علیحدہ کرنا مناسب نہ خیال کیا لیکن جب ان کا انتقال ہو گیا تو امام موصوف اپنی حسرت پوری کرنے کی غرض سے فوراً بلخ کو روانہ ہو گئے لیکن وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ امام قتیبہ انتقال کر گئے - یہ سنکر ان کو بیحد رنج والم ہوا اور اپنی اس محروم القسمتی پر ہمیشہ محزون رہے - ان کے احباب ان کی اس محرومی پر تعزیت کرنے ان کے پاس آئے -

جہاں علما کا فیض علوم دینی و دنیوی عامتہ الناس کے لیے اس قدر وسیع تھا وہاں مسلمان امرا اور سلاطین بھی اس چشمہ سے کچھ کم فیضیاب نہ تھے چنانچہ بنی موسیٰ اور سیف الدولہ کے علمی فضائل اظہر من الشمس ہیں - اسی طرح فخر الدولہ کے وزیر اعظم صاحب ابن عباد علم ادب میں مہارت کامل رکھتے تھے ایک موقعہ پر ان کو امیر بخارا نے اپنی وزارت کے معزز عہدے سے سرفراز کرنے کے لیے طلب کیا تو انہوں نے منجملہ دیگر عذرات ایک یہ عذر بھی پیش کیا تھا کہ میری کتابوں کے اٹھانے کے واسطے چار سو اونٹوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ سفر کرتے تھے تو صرف علم ادب کی کتابوں کے تیس اونٹ ان کے ہمراہ ہوتے تھے -

یہی وہ گروہ اسلام تھا جو علوم ظاہر و باطن سے کماحقہ' واقفیت پیدا کر کے تمدنی زندگی - حق پسندی اور راست گوئی کا بہترین نمونہ تھے - ایثار خلق اور

صلح جوئی کے خوگر تھے۔ ایثار وخلق کا جو نمونہ انہوں نے پیش کیا وہ تواریخ زمانہ میں ملنا ایک حد تک محال ہے اس کی مثال میں ہم صرف ایک واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں جو بہت مشہور ہی یعنی جنگ یرموک میں جب قتل و غارتگری کے بعد ہر چہار طرف کشتوں کے پشتے نظر آتے تھے اس وقت حضرت حذیفہ عدوی اپنے چچا زاد بھائی کی تلاش میں تھوڑا سا پانی لیکر نکلے اتفاقاً ان کو ایسی حالت میں پایا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کر رہے تھے اور شدت پیاس سے بیتاب تھے انہوں نے ان کو وہ پانی پلانا چاہا لیکن دفعتاً آواز آئی کہ کاش پانی ہوتا! اس نازک حالت میں بھی انہوں نے اپنی پیاس پر دوسرے کی شدت تشنگی کو ترجیح دی اور ان کی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے اپنے بھائی کو اشارہ کیا کہ یہ پانی ان کو دیدو مجھسے زیادہ وہ ضرورتمند معلوم ہوتے ہیں لیکن جب وہ پانی لیکر وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ شخص جن کو پانی کی ضرورت تھی شہید ہو چکے ہیں بالاخر پھر اپنے بھائی کے پاس پانی واپس لائے لیکن اب شدت پیاس سے بیتاب ہو کر یہ بھی اپنے ایثار کا نمونہ دنیا میں چھوڑ کر جام شہادت نوش کر چکے تھے۔

اس طرح پر جو نمونہ خلق و تواضع کا ان لوگوں نے پیش کیا وہ اسی اخوت اسلامی کے اصول پر کاربند ہونیکا نتیجہ تھا۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ امام مالک سے عمر میں تیرہ سال بڑے تھے اور فضل وکمال میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے لیکن جب امام مالک سے ملاقات کرتے تھے تو اس طرح پر جیسے کہ چھوٹے اپنے بڑوں سے ملتے ہیں:

حضرت بن عمر وا امام مجاہد کے گھوڑے کی رکاب تھام لیا کرتے تھے محض اسی وجہ سے کہ وہ تابعی تھے۔

اشہب ابن عبد العزیز کہتے ہیں کہ "میں نے امام ابو حنیفہ کو امام مالک کے سامنے ایسا مؤدب بیٹھے دیکھا ہے جیسے کہ خورد اپنے بزرگوں کے سامنے باادب بیٹھا کرتے ہیں"۔ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل کے پاس امام ذہلی آئے تو امام حنبل ان کی تعظیم کے لیے سروقد کھڑے ہو گئے۔ درآنحالیکہ ان کا مرتبہ ان سے کہیں زیادہ تھا۔ اُنہوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ اپنے صاحبزادگان اور شاگردوں کو بھی ان کے پاس بھیجدیا تھا کہ ان سے سبق لیا کریں۔

امام محمدؒ اور امام شافعی میں بعض جزئیات میں باہم اکثر اختلاف رہا لیکن باوجود اس کے امام محمدؒ جس قدر امام شافعی کی عزت و توقیر کرتے تھے اتنی کسی دوسرے عالم کی نہیں کرتے تھے۔

سوانح ائمہ ان مثالوں سے پر ہیں کہ اُنہوں نے اپنے نفس کی خود پسندی کو کبھی حق پر غالب نہیں ہونے دیا اور جلیل القدر اماموں اور پیشواؤں نے اپنے شاگردوں کی شاگردی میں بھی عار نہیں کیا ہے چنانچہ یحییٰ ابن معین اپنے شاگرد رشید امام حنبل کی نسبت فرماتے تھے کہ "لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں مثل احمد ابن حنبل کے ہو جاؤں لیکن خدا کی قسم میں ان کے رتبہ کو نہیں پا سکتا" یہ رائے ایک اُستاد کی اپنے شاگرد کے بارے میں ہے۔

اسی طرح حماد ابن زید اپنے ہمعصر محدث شعبہ کی نسبت فرماتے ہیں کہ "جب کسی حدیث میں میری اور شعبہ کی مخالفت ہوتی ہے تو میں اپنی رائے کو چھوڑ دیتا ہوں اور شعبہ کی رائے کو اختیار کر لیتا ہوں اس لیے کہ وہ اپنے استاد سے ایک حدیث کو بیس مرتبہ سنکر بھی تسکین نہیں پاتے تھے اور میں صرف ایک مرتبہ ہی سُنکر قناعت کر لیتا تھا"۔ امام زین العابدین اپنے شاگرد زید ابن اسلم کے پاس بغرض استفادہ بیٹھا کرتے تھے۔ اسلامی اصول تمدن کے لحاظ سے دشمنوں تک کو بُرا کہنا یا ان پر لعنت کرنا یا ان کے ساتھ بُرا سلوک کرنا بھی کسی طرح جائز نہیں بلکہ غیر مذاہب کے لوگوں سے مراعات کرنے کے لیے ہدایات کی گئی ہیں

جب کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ کو قتل کر کے ان کے ناک کان کاٹے تھے اور ابو سفیان کی بی بی نے ان کا جگر چبا ڈالا تھا تو اس وقت آپ کو اس حادثہ کا اسقدر فطری رنج ہوا تھا کہ آپ نے مشرکین کے حق میں بددعا فرمائی لیکن فوراً الہام الہی ہوا کہ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ۔ چنانچہ آپ بددعا سے باز رہے اور فرمایا کہ میں جب کبھی بھی موقع ملے گا ان کے چالیس آدمیوں کو مُثلہ کر کے چھوڑوں لیکن اس کے متعلق بھی حکم خداوندی ان الفاظ میں نازل ہوا کہ فَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ۔ آنحضرت نے مخالفین کو ان کی مراعات اور مناسب تکریم کا حکم دیا اور اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ آپ کے صحابہ کرام اکثر اسیران جنگ کی خاطر مدارات کرتے

تھے اپنی روٹی تک ان کو دیدیتے تھے اور خود صرف کھجوروں پر بسر کرتے تھے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی بنا پر آگے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ شریف رضی جیسے شریف النسب نے اپنے ہمعصر ابو اسحٰق کی وفات پر اس کے شاعرانہ کمالات کی وجہ سے مرثیہ لکھدیا تھا حالانکہ وہ مذہب اسلام کا مخالف ایک صابی شخص تھا۔

تمدنی زندگی کا اصلی معیار دولت و ثروت کی کثرت خیال کی جاتی ہے چنانچہ جو اقوام زیادہ متمدن سمجھی جاتی ہیں وہ متمول اور مالدار بھی ہوتی ہیں لیکن اسلام کی تصویر میں یہ رخ ہر جگہ سے غائب دکھایا جاتا ہے اور اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ وہ ایسی جماعت یا اس سوسائٹی سے متعلق ہے جو ہمیشہ فقر و فاقہ میں بسر کرتے ہیں اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے گمنامی کے عالم میں مسجدوں کے حجروں میں بود و باش رکھتے ہیں گویا جس طرح تمدن و تمول لازم و ملزوم ہیں اسی طرح اسلام و افلاس ایک دوسرے کا جزء ہیں ان گذر اوقات خیرات و زکاۃ پر ہوتی ہے اور ان میں خود کمانے کی اہلیت ہی نہیں ہوتی بلکہ دوسرے اقوام کے دست نگر رہتے ہیں۔

یہ اسلام کی وہ تصویر ہے جو اس بیسویں صدی عیسوی میں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیائے اسلام میں نظر آتی ہے۔ لیکن اگر ذرا کتاب الٰہی کی طرف رجوع کیا جائے تو اس مسئلہ پر نص صریح ہم کو ملتی ہے کہ لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ یعنی دنیائے اسلام کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ تم لوگ اپنی ہمتوں کو پست مت کرو بلکہ مومن ہمیشہ ممتاز رہتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ لَا بَأْسَ بِالْغِنَىٰ لِمَنِ

اتقی اللہ عزوجل۔ اسی طرح ایک دوسری حدیث شریف جو حضرت سعد سے مروی ہے ان الفاظ میں اس مضمون کی تائید ہوتی ہے کہ اِنَّ اللہَ یُحِبُّ العَبدَ التقی الغنی الخفی۔

اسی طرح اگر اسلامی تواریخ سابقہ کو دیکھا جائے تو واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام کی جو تصویر اوپر کھینچی گئی ہے وہ واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ گو اہل کمال کے لئے مالدار ہونا کوئی خوبی نہیں ہے یا کسی مسلم کا دولت و ثروت میں تعیشانہ زندگی بسر کرنا لازمی نہیں ہے اور نہ اس کے عدم وجود سے ان کی عظمت و وقعت عزت و حرمت میں کسی طرح کی کمی ہو سکتی ہے لیکن تاہم یہ ایک دوسرے کے منافی بھی نہیں ہیں۔ باعتبار چند وجوہ اور حالات خاص اس کا مخالف پہلو ذہنوں میں راسخ ہو گیا ہے ورنہ انہیں علمائے دین۔ اولیائے متین اور آئمہ مذہب کے گروہ میں ایسے لوگ گذرے ہیں جنہوں نے ایسی دولت و ثروت کو جو سرتاپا غفلت تصور کی گئی ہے کس طرح خیر و برکت کا سبب بنا دیا تھا۔ اور باوجود متمول ہونے کے عنان مذہب کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اگرچہ اس قسم کے نظائر بکثرت ہیں لیکن اس موقع پر چند بطور مثال پیش کی جاتی ہیں۔

امام لیث مصری کی سالانہ آمدنی اسی ہزار اشرفیاں تھیں جس کے حساب سے سکہ رائج الوقت کے آٹھ لاکھ روپیہ ہوتے ہیں لیکن باوجود اس قدر دولت کثیر کے ان پر کبھی زکاۃ فرض نہیں ہوئی یعنی وہ ایک سال پورا گذرنے سے پہلے ہی سب

آمدنی مصارف خیر میں صرف کر دیا کرتے تھے۔

دوسرے بزرگ امام دعلج بغدادی تھے جو دارقطنی کے اُستاد تھے ان کی ثروت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عراق اور سجستان کے علمائے حدیث کو ان کے یہاں سے وظائف ملا کرتے تھے ان کا ایک مکان مکہ مکرمہ میں تھا۔ جس کو اُنہوں نے تیس ہزار اشرفی میں خرید کیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد تین لاکھ اشرفیاں معز الدولہ کو ترکہ میں ملی تھیں۔

امام ابو الہیثم کی بابتہ یہ لکھا ہے کہ وہ بہت زیادہ مالدار تھے اور اُنہوں نے تین چار مرتبہ اپنے ہم وزن چاندی خیرات کر دی تھی حافظ ابن العربی کی دولت اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ وہ اس آمدنی کا کل روپیہ نیک کاموں میں خرچ کیا کرتے تھے۔ اشبلیہ جو اندلس میں ایک شہر تھا اس کی تمام شہر پناہ اُنہوں نے اپنے ذاتی روپیہ سے تعمیر کرائی تھی۔

قاضی عیاض صاحب مشارق الانوار کی بابتہ لکھتے ہیں کہ ان کو اپنے زمانہ میں اسقدر وقعت۔ عزت اور دولت حاصل تھی کہ کبھی کسی کو ان کے شہر میں نصیب نہیں ہوئی انہیں کی نسبت ایک موقع پر امام ذہبی فرماتے ہیں کہ جسقدر ان کی رفعت میں ترقی ہوئی اسی قدر ان کی تواضع اور خوف الٰہی میں ترقی ہوتی گئی۔

شیخ ابو حامد اسفرائینی کی بابتہ ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ "ان پر دین و دُنیا کی دولت ختم ہو گئی تھی۔ اور ان کا قیام شہر بغداد میں تھا"۔ گویا جسقدر

وہ متقی اور دیندار تھے اسی قدر وہ صاحب ثروت بھی تھے۔

یہی بزرگانِ دین اور علمائے کرام جو اسلامی تمدن کا پیش خیمہ تھے اپنی ظاہری صفائی اور پاکیزگی طبع میں بھی دیگر ہمعصر اقوام سے کچھ کم نہ تھے چنانچہ امام دارالہجرت حضرت مالک نہایت قیمتی اور فاخرہ لباس زیب تن فرماتے تھے انہیں کا یہ مقولہ ہے کہ "میں نے مدینہ طیبہ میں جتنے فقہا دیکھے وہ سب خوش پوشاک دیکھے"۔

امام ابوحنیفہ نہایت بیش قیمت لباس پہنتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ ابن المبارک کے چادر کا تخمینہ کیا گیا تو تیس اشرفی ہوا تھا اور ایک اور مرتبہ ان کے پیراہن اور ایک دوسری چادر کی قیمت چار سو درہم اندازہ کی گئی تھی۔

امام اعظم جب کبھی باہر تشریف لیجاتے تھے تو دور دور سے لوگ پہچان لیتے تھے کہ امام صاحب تشریف لا رہے ہیں چونکہ نہایت بیش قیمت اور اعلیٰ قسم کا عطر ہمیشہ استعمال فرمایا کرتے تھے۔

شیخ الاسلام ہروی جن کا زہد و ورع مشہور ہے ان کی بابت لکھا ہے کہ وہ جب کبھی باہر جایا کرتے تھے تو لباس فاخرہ پہنے ہوتے تھے اور ایک بیش قیمت گھوڑا ان کی سواری میں ہوتا تھا۔ وہ خود فرماتے تھے کہ "میں اپنا ذاتی اظہار حشمت نہیں چاہتا ہوں بلکہ اسلام کے معزز کرنے کے لیے یہ استعمال کرتا ہوں"۔

اسلامی تمدنی تاریخ میں جہاں ہم کو اس قدر صاحب ثروت ہستیاں نظر آتی ہیں جن کی دولت نے ان کے دین میں چار چاند لگا دیئے تھے وہاں دوسری طرف

ہم کو ایسے افراد بھی ملتے ہیں جو اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دیتے تھے اور ان کی شان و عظمت میں کوئی فرق نہ آتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دولت و ثروت منافی ورع و اتقا نہیں اسی طرح عدم زر و جواہر بھی دین میں کسی طرح حارج نہیں ہوتا۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام لائف اس کا ثبوت ہے کہ باوجود طاقت و قدرت آپ نے دولت و ثروت کو باعث عزت کبھی خیال نہیں فرمایا چنانچہ آپ ہمیشہ اپنے دستِ مبارک سے بکریوں کو دوہا کرتے تھے اور پھٹے کپڑوں کو سیتے تھے حضرت انس سے مروی ہے کہ "میں دس سال تک پیغمبر خدا کی خدمت اقدس میں رہا اور اس زمانہ میں جسقدر کام انہوں نے میرے کر دئے اتنی خدمت میں نہ کر سکا"!۔

امام جمال استاد حدیث کی بابت لکھا ہے کہ جب امام ابن طاہر نے ان کی خدمت میں تحصیل علم کے لیے جانا چاہا تو لوگوں نے ان کو یہ پتہ دیا کہ امام صاحب موصوف بازار میں ملیں گے چونکہ خرید و فروخت کے لیے وہ اکثر وہیں جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ جب یہ وہاں پہنچے تو اول بازاروں میں گشت لگایا اور بالآخر امام صاحب کو اس ہئیت میں پایا کہ اپنے دامن میں تمام ضروری اشیا بھرے ہوئے ایک عطار کی دوکان پر بیٹھے تھے اس وقت ان کی عمر بھی اناسی سال کی تھی۔

امام بخاری نے شہر بخارا سے باہر ایک سرائے تعمیر کرائی اس کی تعمیر کے وقت

جب مزدور اینٹیں لیجاتے تھے تو امام صاحب خود اینٹیں اُٹھا اٹھا کر مزدوروں کے ساتھ معماروں کو دیتے جاتے تھے اس وقت کسی شاگرد نے ازراہ دلسوزی ان سے سوال کیا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ "یہ ایسا کام ہے جو نفع دیتا ہے اور اللہ تعالے مجھکو سلف صالحین کے اتباع کرنے کا اجر دیگا"۔

یہ وہ بزرگان ہیں جو اپنے زمانے کے امام وقت ہوئے ہیں گویا چشمہ علم و فضل سے پورے طور پر سیراب ہو چکے تھے دولت اور ثروت اس سے ہی ظاہر ہے کہ ایک مسافر خانہ اپنے ذاتی روپیہ سے تعمیر کرا رہے تھے گویا کہ بخارا کے رئیس اعظم تھے لیکن باوجود اس کے محض اتباع سلف کے خیال سے اپنے ہاتھوں سے کام کرتے تھے۔ کیا اس سے ان کی توقیر میں کچھ بھی فرق آیا؟ ان کی شان اسوقت بدستور قائم تھی بلکہ اس میں اور اضافہ ہو گیا کہ آجتک وہ اخلاف کے لیے نظیر قائم کر گئے جس کی مثال کسی دوسری قوم میں ملنا مشکل ہے۔

اس موقع پر عرب کا وہ شاندار دور بھی دکھا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جو فی زمانا ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ یہی سرزمین عرب جو دور بداوت سے نکل کر دور حضارۃ میں آ چکی تھی اُن تمام اشیائے ضروریہ سے متمتع ہوئی جن کی اختراعات نے آئندہ نسلوں کو محو حیرت بنا دیا۔ تواریخ کی ورق گردانی نمایاں طور پر بتاتی ہے کہ اس نے کس طرح تنظیم ممالک کی طرف توجہ کی۔ مفتوحہ و مقبوضہ ملکوں کی زمین کو شاداب و بارآور بنایا۔ بڑے بڑے بندرگاہوں

تسخیر کے بعد تجارتی سلسلوں کے بڑھانے کے لیے بڑے تیار کیے۔ اس کے بعد جب ملک اقتصادی مصائب و آلام سے گذر گیا اور سیاسی اغراض کی جنگ ختم ہو گئی تو ان کی طبیعت کی جودت علوم و فنون ۔صنعت و حرفت ایجادات واختراعات کی طرف متوجہ ہوئی جو ایک متمدن قوم کا فطری جذبہ ہوتا ہے۔ تمام علوم و فنون جو مختلف زبانوں میں موجود تھے ان کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی سعی کی گئی۔ چنانچہ خلیفہ مامون رشید نے اپنے زمانہ خلافت میں یونان کے تمام علوم عربی زبان میں ترجمہ کرائے ان علوم کا ایک بڑا حصہ فلسفہ اور منطق کے دقیق مسائل پر مشتمل تھا۔ بعد ازاں عربوں نے علم منطق۔ فلسفہ ریاضی جغرافیہ طبعیات ۔ جر ثقیل۔ فنون اکتشافات ۔علم حیوانات و نباتات علم طب مصوری ۔سنگ تراشی ۔فن تعمیر اور فن تجارت میں نمایاں ترقی کی ان میں سے اکثر خود انہیں کی ایجاد بھی ہیں۔

اس کے علاوہ ملکی و معاشرتی انتظامات بین الاقوامی تعلقات اور اصول سلطنت وہ امور تھے جن کی بنا پر تمدن کی عمدگی کا انحصار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ بھی عرب میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ ان کے ملکی و معاشرتی قوانین قرآن حکیم وسنت رسول کریم سے ماخوذ تھے۔ صحابہ و تابعین کے دور تک وہ عجمیت سے اس قدر متصل نہوے تھے کہ طرز معاشرت میں کوئی نمایاں ترقی کا اضافہ کرتے۔ ان کی معاشرتی زندگی بالکل سادہ تھی جو قرآن شریف اور احادیث

سے ماخوذ تھی۔ باہمی مقدمات کے فیصلے نہایت سادگی اور صحیح اصول پر کئے جاتے تھے اور مساوات ان میں حد درجہ قائم تھی۔ ایک مسلمان خواہ وہ کسی گوشہ ملک کا رہنے والا کیوں نہ ہو کسی اسلامی ملک میں جاکر مبتذل نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے وہ تمام حقوق تھے جو وہاں کے خاص مسلمان باشندوں اور امیروں کے لئے ہو سکتے تھے۔ ان کی اپنی ذمی رعایا کے ساتھ ان کا برتاؤ نہایت عمدہ تھا ایک معمولی سے ٹیکس کے عوض میں ان کی جان و مال اور عزت کی نگہبانی کیجاتی تھی۔ یہاں تک کہ ملک کے ممتاز اور عہدہائے جلیلہ پر فائز کئے جاتے تھے اور ان کو کسی بات میں روک ٹوک نہ تھی۔ ان کی معاشرتی زندگی نہایت مکمل تھی جس کا اعتراف خود اہل یورپ کرتے ہیں۔ چنانچہ موسیو لیبلے جو ایک نہایت محقق عالم اور مذہبی مصنف ہیں اور جنہوں نے مشرق پر ایک بے نظیر کتاب تصنیف کی ہے ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "مسلمان اُن نظامات میں جو مزدوری پیشہ اقوام کی بہبودی کے متعلق ہیں اس وقت تک ان سخت غلطیوں سے بچے ہوئے ہیں جو مغرب میں بالعموم واقع ہوتی ہیں۔ اور ان میں اب تک وہ عمدہ نظامات کامل طور سے باقی ہیں۔ جن کے ذریعہ سے انہوں نے امیر و غریب۔ غلام و مالک میں صلح قائم رکھی ہے۔ اسی قدر کہدینا کافی ہے کہ وہ قوم جس کو تعلیم دینے کا دعویٰ یورپ کر رہا ہے فی الواقع وہ قوم ہے جس سے خود اسے سبق لینا چاہیئے"۔

اس کے بعد ہم عربوں کے ملکی نظامات کے متعلق بیان کرتے ہیں اگرچہ

اس کے متعلق مبسوط و مفصل لکھنے کے لیے مستقل ایک تصنیف کی ضرورت ہے لیکن اس کا مختصر حال جو عربی تصانیف میں درج ہے۔ لکھتے ہیں۔ خلفائے بنو امیہ نے جب اپنا دار السلطنت مدینہ منورہ کے بعد دمشق تجویز کیا تو اس کے ساتھ ہی تمام ملکی انتظامات میں ترقی کرنا شروع کی لیکن اس ترقی کا عروج عباسیوں کے زمانہ میں ہوا چنانچہ خاندان عباسیہ کے عروج کا آفتاب جب نصف النہار پر پہنچا تو انہوں نے دمشق کے دار السلطنت کو بدل کر دجلہ کے اوپر بابل کے قریب شہر بغداد کی بنیاد ڈالی اور اس کو اسقدر ترقی دی کہ اس نے بہت ہی تھوڑے زمانہ میں مشرق کے شہروں میں ایک عالمگیر شہرت حاصل کر لی اور بتدریج وہ دنیا کا عظیم ترین شہر بن گیا۔ جب خلیفہ ہارون الرشید بیس سال کی عمر میں سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے اپنے وسیع ملک کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے شروع کیا۔ تمام ملک میں سڑکیں بنوائی گئیں اور ڈاک قائم کی گئی۔ جن کے ذریعہ سے قاصد دور دور کے فاصلہ تک باسانی اور بسرعت پہنچنے لگے۔ ہم کو کتب تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ نامہ بر کبوتروں کی ڈاک کا انتظام بھی اسی زمانہ میں نہایت اہتمام کے ساتھ شروع ہوا اور جس طرح یورپ میں محکمہ ڈاک کو اہمیت دیجاتی ہے اسی طرح بغداد میں بھی اس کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر تھا اور خطوط رسانی کا محکمہ ایک مہتم بالشان محکمہ خیال کیا جاتا تھا۔ ہر ایک صوبہ میں ایک والی یا گورنر تھا جس کے ہاتھ میں

صوبہ کی پوری حکومت ہوتی تھی۔ دور دراز ممالک مثلاً شمالی افریقہ وغیرہ کے والی یا گورنر خلیفہ کے قائم مقام ہوتے تھے اور ان کا عہدہ موروثی تھا اور وہ کسی قدر خود مختار بھی ہوتے تھے ملک کا مالی انتظام نہایت ہی باقاعدہ تھا اور آمدنی کے ذرائع حسب ذیل تھے:۔

(۱) ذاتی و شخصی محصول (۲) مقبوضہ آراضی پر معمولی سا محصول

(۳) محصول جنگی (۴) محصول غیر مزروعہ آراضی پر

مورخین عرب لکھتے ہیں کہ خلافت کی مجموعی سالانہ آمدنی اس زمانہ میں دس کرڑور روپیہ تھی جو اس وقت ایک نہایت خطیر رقم خیال کی جاتی تھی۔ مالگذاری کی نگرانی ایک مجلس وزرار کے سپرد تھی جس کو دیوان کہتے تھے۔ ابن خلدون ایک بڑا مورخ اپنی تاریخ کے مشہور مقدمہ میں لکھتا ہے کہ انتظام مالگذاری کا دیوان اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ آمدنی کی نگرانی اور شاہی حقوق کی حفاظت کرے۔ اور آمدنی اور خرچ میں تناسب قائم رکھے اور فوج کی تعداد اور اس کی تنخواہ مقرر کرے۔ اس دیوان میں بہت ہی لائق محاسب رکھے جاتے ہیں اور ان کو منشیان دیوان کہتے ہیں۔ دیوان کا اطلاق اس عمارت پر بھی ہے جس میں وزرار جمع ہوتے ہیں۔

ملک کا انتظام چار محکموں پر منقسم تھا۔ اول محکمہ جنگ دوم محکمہ مالگذاری جس کا کام محصولات کا تعین کرنا تھا۔ سوم محکمہ شخصی جس کا منصب ان عہدہ داران کو

مقرر کرتا تھا جو محصولات کو وصول کریں اور چوتھا محکمہ انتظامی تھا جس کا کام آمدنی اور خرچ کی نگرانی تھی۔ خلیفہ کے تمام احکامات قلمبند ہو کر دفتر میں محفوظ رکھے جاتے تھے تاکہ خلفائے مابعد بآسانی ہر وقت ان کی طرف رجوع کرسکیں۔ ان تمام محکمجات کا انتظام ایک وزیر اعظم کی سپرد ہوتا تھا جو بطور مدار المہام ہوتا تھا۔ اور بالعموم خلفائے وقت تمام امور ملکی کو اس کی ہی اعلیٰ قابلیت وحسن انتظام پر چھوڑ دیتے تھے۔

اسی طرح مثل محکمہ ڈاک خانہ شہروں کی نگرانی کا انتظام بھی کوتوال کے متعلق نہایت عمدہ طور پر تھا۔ تاجروں کی مجلسیں قائم کردی گئی تھیں جن کا منصب یہ تھا کہ وہ معاملات تجارت کی جانچ پرتال اور فریب و دغابازی کا انسداد کریں۔ خلفائے عباسیہ کے آمدنی اور خرچ کے اعلیٰ انتظام نے انھیں بہت بڑے بڑے رفاہ عام کے کام کرنے کا موقع دیا تھا۔ چنانچہ ملک میں سڑکیں تیار کرادی گئیں تھیں۔ کاروانسرائے۔ مساجد۔ شفاخانے۔ مدارس ہر طرف علی الخصوص بصرہ بغداد۔ اور موصل میں بکثرت قائم ہو گئے تھے۔ اسی طرح زراعت اور صنعت و حرفت نے بھی بڑی ترقی کی تھی۔ باریک اور عمدہ کپڑوں کے کارخانے موصل۔ حلب۔ اور دمشق میں اعلیٰ پیمانہ پر قائم تھے۔ نمک۔ گندھک۔ سنگ مرمر لوہے اور سیسہ کی کانیں بہت ہی باقاعدہ طور پر کھودی جاتی تھیں اور ان کی پیداوار مصرف میں آتی تھی۔ تعلیم عام کا محکمہ بھی ایک بہت وسیع اصول پر قایم

کیا گیا تھا۔ تمام حصہ عالم سے مشہور فضلا اور اساتذہ بلائے گئے تھے۔ علم ہیئت کی اس درجہ ترقی ہوئی تھی۔ کہ وہ کام جس کو اس وقت اقوام یورپ نے زمانہ حال میں اختراع کیا ہے وہ کہیں پہلے ہو چکا تھا۔ مثلاً دائرہ نصف النہار کے ایک قوس کی پیمائش کی جا چکی تھی۔ قدمائے روم اور ایران کا کلام بالخصوص وہ کلام جو فلسفہ و ریاضیات سے متعلق تھا تمامتر بزبان عربی ترجمہ ہو چکا تھا اور کل مدارس میں پڑھایا جاتا تھا۔ زمانہ قدیم کی تحقیقات بھی جو یورپ میں کئی صدی بعد شروع ہوئی عربوں میں عام طور پر جاری تھیں۔ عربوں کے لیے حصول علم ایک بالکل نیا مشغلہ تھا جس میں اُنہوں نے نہایت شغف سے کام کیا اور بیحد مستعدی ظاہر کی چنانچہ عام کتب خانے علمی مدارس میں بکثرت ہر جگہ قائم ہو گئے تھے۔ علم حاصل کرنے کی خواہش اس درجہ تھی کہ خلفائے بغداد ہر ایک تدبیر سے دنیا کے مشہور علمار اور اہل کمال کو اپنے دار السلطنت میں جمع کرتے تھے۔ ایک خلیفہ نے تو شہنشاہ مشرق سے محض اس بنا پر اعلان جنگ کیا تھا کہ وہ ایک مشہور مہندس کو بغداد میں درس دینے کے لیے بھیجنے پر مجبور ہو جائے علما ر فضلا ہر قوم و ہر مذہب کے یونانی۔ ایرانی۔ قبطی۔ کلدی اس شہر بغداد میں آکر جمع ہو گئے تھے اور اُنہوں نے اسے تمام دنیا کے علوم کا مرکز بنا دیا تھا۔ ابو الفرج ایک مقام پر لکھتا ہے کہ "ہارون الرشید کے بیٹے مامون الرشید کا یہ قول تھا کہ علما اللہ تعالےٰ کے ان خاص بندوں میں ہیں جن کو اس نے فہم و ادراک کو کامل کرنے کے لئے

انتخاب کیا ہے یہ لوگ دنیا کی مشعلیں اور رہبران نوع انسانی ہیں اگر یہ نہوں تو تمام دنیا اپنی وحشی حالت پر آجائے جبکہ خلفائے بغداد کے دربار میں اس قسم کے باکمال اشخاص موجود تھے تو پھر وہ کیوں نہ اپنے دارالخلافہ کو تمام عالم میں اول خیال کرتے اس دربار میں نہ صرف علم ہی کا چرچا تھا بلکہ اس کی شان و شوکت بھی بے انتہا تھی۔ ابوالفدا نے ۳۰۵ھ میں سفیر دولت مشرقی کے بغداد میں آنے اور اس کی پذیرائی کا حال لکھا ہے اس سے ہمیں بغداد کی مشرقی شان و شوکت کا اندازہ ہوسکتا ہے وہ لکھتا ہے کہ "خلیفہ کی تمام فوج کمربستہ تھی سوار اور پیدل کی جمعیت سولہ ہزار تھی۔ فوجی افسر زرق برق وردیاں پہنے اور پُر تکلف پرتلے لگائے ہوئے جن میں موتی اور سونا چمک رہا تھا اپنے افسر اعلیٰ کے گرد صف بستہ تھے۔ ان کے پیچھے سات ہزار خواجہ سرا تھے جن میں چار ہزار گورے چٹے تھے۔ ان کے بعد سات سو محلسرا کے محافظ تھے۔ مرصع کار کشتیاں دریائے دجلہ پر اپنے پھریروں کا لطف دکھا رہی تھیں قصر شاہی کے اندر عجیب قسم کا تکلف تھا۔ اڑتیس ہزار مشجر کے پردے جابجا آویزاں تھے جن میں ساڑھے بارہ ہزار ریشمی کلابتون کے کام کے تھے۔ بائیس ہزار قالینوں کا فرش تھا۔ خلیفہ کے سامنے سو شیر ببر تماشہ کر رہے تھے اور ہر ایک کے لیے علحدہ علحدہ محافظ تھے ایک درخت سونے اور چاندی کا تھا جس کی اٹھارہ شاخیں تھیں اور ان پر ہر قسم کی چڑیاں بیٹھی

زمرد سے سبز تھیں۔ درخت کے پتے اور چڑیاں مختلف بیش بہا فلزات سے بنی ہوئی تھیں درخت بالکل قدرتی معلوم ہوتا تھا گویا ابھی جنگل سے اکھڑ کر آگیا ہے۔ ان تمام پر تکلف سامان آرائش میں سے گذار کر وزیر اعظم نے سفیر مشرقی کو خلیفہ کے تخت تک پہنچا دیا۔

خلفائے بغداد کی فوجی قوت کا اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ شہنشاہ قسطنطنیہ جو یونان و روم کے جانشین تھے خلیفہ کو لازمی طور پر خراج دیا کرتے تھے۔ نیسی فور نے جو شہزادی آئرنی کے بعد تخت نشین ہوا۔ خلیفہ ہارون الرشید کو لکھا کہ میں آیندہ سے خراج نہ دونگا۔ اس کے جواب میں جو خط خلیفہ نے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین روم و یونان کی تخت نشین اولاد کس طرح عربوں کی نظروں میں ذلیل و رسوا تھی چنانچہ وہ جواب یہ ہے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ہارون الرشید امیر المومنین کی جانب سے بنام رومی کتے نیسی فور کے۔ او کافر کے بچے! میں نے تیرا خط پڑھا۔ میرے جواب کا متوقع نہ رہ تو خود دیکھ لے گا کہ کیا ہوتا ہے" اور فی الواقع اس سگ رومی نے دیکھ بھی لیا۔ ہارون الرشید نے اس کے تمام ملک کو زیر و زبر کر ڈالا اور اس عیسائی شہنشاہ قسطنطنیہ کو خلیفہ اسلام کی بارگاہ میں خراج دینا ہی پڑا۔

یہاں تک تو عربوں کے معاشرتی و ملکی تمدن کا بیان تھا اب ہم ان کے علوم فنون اور دیگر محاسن کا ایک سرسری خاکہ کھینچتے ہیں علم ادب یعنی ان کی اپنی

عربی زبان درحقیقت خود آنحضرت صلعم کی بعثت کے قبل ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ حماسہ کے اکثر اشعار سبعہ معلقہ دیوان نابغہ وغیرہ وغیرہ یہ سب عہد جاہلیت کے شعرا کا نمونہ ہیں۔ عکاظ جو مکہ سے تین دن کی راہ پر ایک قصبہ ہے۔ وہاں شعرائے عرب کا اجتماع ہوا کرتا تھا اور ان میں کے بہترین اشعار خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں کر دیئے جاتے تھے۔ لیکن نثر میں اس وقت تک کوئی خاص کمال پیدا نہوا تھا۔ اور نہ اس وقت کوئی ممتاز ناثر تھا۔

بنی امیہ کے دور خلافت میں اکثر اہلِ کمال پیدا ہوئے اور بنی عباس نے تو شعرا اور اہل ادب سے تمام ملک کو بھر دیا۔ فنِ ادب میں بھی مختلف شعبے ہوگئے اور نظم و نثر۔ ضرب الامثال۔ معانی و بلاغت۔ اور لغت میں الگ الگ کمال پیدا کیا جانے لگا۔ چنانچہ جاحظ۔ شیخ عبدالقاہر جرجانی۔ ابوالقاسم حریری۔ بدیع الزماں ہمدانی۔ ابوالفرج اصفہانی وغیرہ یہ سب ادب کے مختلف شعبوں کے امام ہوئے۔

اسی طرح نظم میں حسان بن ثابت۔ اعشیٰ۔ عروۃ الورد۔ ابوالعلا معرّی۔ ابو نواس۔ متنبی۔ قطری بن الفجاہ دیگر بیشمار شاعر نامور پیدا ہوئے۔ اور یہ مذاق عرب کے خمیر میں داخل ہوگیا۔ ان کا بچہ بچہ اس سے واقف تھا اور یہ جس ملک میں گئے یہ فن لطیف ان کے ساتھ گیا۔ چنانچہ یورپ نے اس فن کو اندلس کے عربوں سے سیکھا اور ان کی شاعری کا ماخذ، عرب شعرا کے کلام ہیں۔

ردیف اور قافیہ کا استعمال بھی عربوں ہی کے ذریعہ سے یورپ نے پایا اور استعمال کیا۔

علم منطق اور فلسفہ جس کو عربوں نے یونان سے ترجمہ کیا تھا وہ وہیں تک محدود نہ تھا بلکہ ان میں بہت حصہ ان کی ذاتی سعی و کاوش کا تھا۔ یونان کے ماہرین ارسطو۔ ڈاکلینز۔ ہرقل۔ سقراط۔ ایپی کیورس اور کل فلاسفروں کی تصانیف عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں اور وہ اپنی ذاتی محنت سے اپنے استادوں سے کہیں زیادہ بڑھ گئے تھے۔ سب سے بڑی بات جو انہوں نے پیدا کی وہ یہ تھی کہ تقلید کو چھوڑ کر انہوں نے اس میں اجتہاد کیا اور اقوال و آراء کو پس پشت ڈال کر تجربہ اور مشاہدے سے کام لینا شروع کیا۔ تجربات اور مشاہدات کو اقوال علما کے مقابلہ میں اصل علمی تحقیق قرار دینا بیکن مشہور فلسفی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ ہر وہ شخص جس کو عربی فلسفہ سے کچھ بھی ذوق ہے جانتا ہے کہ ان کا طریقہ معلوم سے غیر معلوم کا حاصل کرنا۔ واقعات و حوادث کا صحیح مشاہدہ کر کے اس کی علت بتانی اور قضایا ئی کاذبہ سے اجتناب اور انہیں غیر صحیح اللنتائج سمجھنا انہیں عربوں نے بتائے اور جاری کئے اور یورپ نے اس طریقہ کو عرب ہی سے سیکھا۔ اس لئے کہ یورپ کی ازمنہ متوسطہ کی یونیورسٹیاں اس عملی تجربہ سے خالی تھیں اسلام میں مشہور فلسفی۔ ابن رشد۔ امام غزالی۔ امام فخر الدین رازی بوعلی سینا وغیرہ

بہت نامور گزرے ہیں۔ یورپ کی یونیورسٹیاں مدتوں تک انہیں کے فلسفہ کا سبق پڑھتی رہیں خصوصاً ابن رشد کا فلسفہ تو سترھویں اٹھارھویں صدی تک یورپ میں پڑھا جاتا رہا ہے۔ ریاضی ونیت کا فن تو یونانیوں کے وقت کا ایجاد کردہ شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن عربوں نے جو بے نظیر ترقی اس فن میں کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اس فن کا رواج اس قدر ہوا کہ عربوں کے بعد اکثر اسلامی بادشاہوں نے اپنی فیاضیوں سے اس کی ترویج میں بڑی مدد کی۔ عربوں کے عروج کے زمانہ میں یوں تو اس کا اصلی مرکز بغداد کو قرار دیا جاسکتا ہے لیکن سمرقند۔ دمشق۔ قاہرہ۔ فاس۔ طلیطلہ۔ قرطبہ۔ یہ سب شہر بھی اس کے مرکز رہ چکے ہیں۔

علم نجوم اور علم الافلاک میں جسقدر اختراعات وایجادات عربوں نے کیں اس کے لیے مستقل ایک تصنیف درکار ہے لیکن فی الحال صرف ان مشہور و معروف ہندسوں کے ناموں پر ہی کفایت کی جاتی ہے جو اس فن میں اُستاد مانے گئے ہیں۔ باوجود مختلف قسم کی بربادیوں اور تباہیوں کے یہ علم مسلمانوں کی تحقیقات کا آماجگاہ اور زیر بار احسان رہا ہے اور بغداد ہی میں سات صدی تک برابر اس کی تعلیم دیجاتی رہی۔ پہلا شخص محمد بن جبر البتانی ہے یہ تمام ہندسین کا امام مانا جاتا ہے اور اس نے تیسری صدی ہجری میں رحلت کی۔ ابن اماجور اور موسٰی ابن شاکر مورخ کے تین بیٹے۔ محمد۔ احمد۔ اور احسن کے نام سے

مشہور ہیں۔ اور یہ تینوں بڑے مہندس شمار کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح ابوریحان محمد البیرونی ہے جو علم ہیئت کا بڑا عالم تھا۔ اس نے دنیا کے مشہور مقامات کا سفر کیا اور ہندوستان میں آکر ہندوؤں سے ان کی زبان ان کے علوم و فنون۔ فلسفہ۔ ادب۔ ان کے اوضاع و اطوار۔ رسم رواج ان کے قوانین و مذہب اور ان کی ضعیف الاعتقادی کا بغور مطالعہ کیا اور پھر ہندوؤں کو بغداد کے مہندسین کی تحقیقات سے مطلع کیا اور اپنے مشاہدات کو قلمبند کیا جو اس کے سفرنامہ کے نام سے مشہور ہے۔ ابن ہشیم مصری یہ بھی دنیا کے ممتاز مہندسین میں سے ہے اس کی کتاب "کتاب المرایا والمناظر" دنیا کی اس فن میں بہترین کتابوں میں سے شمار کی جاتی ہے جس کا قلمی نسخہ مصر کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

علم جغرافیہ اگر بنظر تحقیق دیکھا جائے تو وہ علم ہے جس کی نہ صرف ایجاد و اختراع کا بلکہ اس کو کمال اور انتہا تک پہنچا دینے کا فخر صرف قوم عرب کو ہی حاصل ہے لیکن آج کوئی عربی داں معلم یا متعلم اس کی معمولی واقفیت کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ علم جغرافیہ کے متعلق کچھ معلومات ایک عرب تاجر سلیمان کے سفرنامہ سے ملتے ہیں اور غالباً سب سے پہلا جغرافیہ وہی سفرنامہ ہے۔

مسعودی۔ یہ بھی ایک بڑا جغرافیہ داں ہے اور "مروج الذہب" جس میں منجملہ دیگر مضامین کے ملکوں کی حالت۔ پہاڑ۔ سمندر۔ بادشاہی خاندان اور ان کی اقوام کے شجرے وغیرہ معلوم ہوتے ہیں۔ ابن حوقل۔ البیرونی۔

ابوالحسن علی بن ابی القاسم بن ماجور۔ ابن بطوطہ۔ الاسطخری۔ اور ادریسی یہ سب بڑے جغرافیہ داں اور جغرافیہ نویس ہوئے ہیں۔ مصری شاہی خاندان کے ایک فرد کے سفر نامہ میں جو اُنہوں نے یورپ سے واپس آکر "الدنیا فی بارہیس" کے نام سے شائع کیا ہے ایک فہرست مسلمانوں کے مختلف علوم وفنون کے کتابوں کی درج ہے اس میں زمخشری کی ایک کتاب "کتاب الامکنہ والجبال" کا نام بھی لکھا ہے جس سے اس معشرتی عالم کی علم جغرافیہ سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب المناظر میں روشنی اور شعاعوں سے بھی پوری بحث کی گئی ہے۔ اور مستقیم۔ منعکس۔ منعطف شعاعوں کی نہایت خوش اسلوبی سے بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح جرثقیل کے مختلف آلات جو عربوں نے ایجاد کئے تھے وہ اگرچہ ہم تک نہیں پہنچے لیکن اکثر تصانیف سے ان کا پتہ چلتا ہے گھڑی کے لنگر کا ایجاد کرنا اور خود گھڑی کی اختراع ایک عرب کے سفر نامہ سے معلوم ہوتی ہے۔

جابر ابن حیان ایک مشہور کیمیا داں ہے اور مختلف نامعلوم اجزا کو معلوم کر کے اس نے ان کے خواص کی تحقیق کی ہے اور وہ بڑے بڑے مرکبات جن سے یونانی بالکل ناواقف تھے۔ مثلاً الکحل۔ گندھک کا تیزاب وغیرہ عربوں نے ہی ایجاد کیا۔ جابر کی اکثر تصانیف ضائع ہوگئیں لیکن ان میں سے صرف چند کا پتہ چلا ہے۔ الرازی بھی علم کیمیا کا ایک بڑا ماہر گذرا ہے

جس کی مشہور تصانیف۔ الحاوی۔ الجامع۔ کتاب الاقطاب اور منصوریہ ہیں۔ فنون و اکتشافات عربوں کی بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ عملی طور پر علوم سے حرفت کا کام لیا کرتے تھے اور انہوں نے اپنی صنعت و حرفت میں نمایاں ترقی پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ گندھک پارے۔ تانبے۔ لوہے اور سونے کی کانوں کو وہ نکالنا جانتے تھے۔ ان کو رنگ سازی میں بھی کچھ کم کمال نہ تھا۔ فولاد کو آب دینے میں ماہر تھے جیسا کہ طلیطلہ کی تلواروں سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کے بنے ہوئے کپڑے۔ ہتھیار۔ دباغت چرم اور کاغذ تمام دنیا میں اس وقت مشہور تھے۔ عربوں کی ایک بڑی دقیق ایجاد باروت بھی شمار کی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ بندوق اور توپ کے اختراع بھی عربوں سے ہی منسوب کی جا سکتی ہیں۔ جہاز رانی میں قطب نما کا ایجاد بھی انہیں کا حصہ ہے جس کے بعد یورپ نے اس میں ترقی کی ہے۔

یہ ہی وہ تصویر اسلام جو انقلاب زمانہ کے پر آشوب حالات سے گرد آلود ہو گئی ہے لیکن تاریخی واقعات اور صیقل علم اس کو اپنی اصلی صورت میں دکھا سکتے ہیں یہ تصویر اس صانع قادر کی بنائی ہوئی ہے جس کے سامنے دنیا کی دوسری متمدن اقوام کی تصاویر سب ہیچ ہیں لیکن دیکھنے والوں کو نظر بصیرت کی ضرورت ہے۔

ہم نے اسلام کو ہر پہلو سے غور کر لیا۔ اور تمدنی اور معاشرتی سب شعبوں کے اصول

اوران پر کاربند ہونے والے حضرات نے بھی مشاہدہ کر لیا ہم نے ایک بادشاہ وقت سے لیکر ایک ادنیٰ رعایا تک کو اسی ایک تمدنی اصول کے سلاسل سے منضبط پایا اور حفظ مراتب میں ایک دوسرے کا معین دیکھا۔

ہم نے برائے العین مشاہدہ کیا ہے کہ اسلامی اصول انسانی زندگی کے بالکل مطابق ہیں اسلام نے انسانی ترقی کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے بلکہ تمام امور کے قوانین منضبط کر دیئے ہیں اور انسانی نفس کو ان تمام زنجیروں سے آزاد کر کے جنمیں وہ جکڑا ہوا تھا حکمت اور اعتدال کے ساتھ آزادی دیدی ہے۔ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اصل دین اسلام چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے اور وہ عقائد۔ عبادات۔ معاملات۔ آداب معاشرت اور اخلاص باطنی ہیں۔ فی الحقیقت تمام اصول تمدن پر بھی پانچ چیزیں حادی ہیں اب جو اقوام ان میں سے سب پر عامل نہوں گی کما حقہ متمدن کہلائے جانے کی کسی طرح مستحق نہیں ہو سکتیں۔ چونکہ امن عامہ اور تمدن صرف اس وقت باقی رہ سکتا ہے جبکہ اخلاق درست ہوں اور اخلاق کی کامل درستی صرف اس وقت ہو سکتی ہے جب عقائد درست ہوں اسی طرح یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ اخلاق میں بڑی چیز تواضع اور اس کی ضد تکبر و نخوت نااتفاقی کی جڑ ہے اور تواضع صرف دین قائم رہنے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اخلاق میں جھوٹ نہ بولنا۔ صداقت۔ ہمدردی بنی نوع اور خودغرضی سے اجتناب سب داخل ہیں اور اصول تمدن کے بڑے رکن ہیں جن پر تمام دنیا کا مدار ہے لیکن واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہی اخلاق حمیدہ کسی دو ایسے اشخاص

میں پائے جائیں جن میں سے ایک تو توحید و رسالت کا قائل ہو اور دوسرا اس کا قائل نہو تو یقیناً دونوں میں ایک بیّن فرق ہو جائے گا۔ یعنی منکر توحید و رسالت میں تو یہ اخلاق محدود العمر ہونگے۔ یعنی جب تک ان اخلاق پر عمل کرنے سے ان کے دنیوی منافع فوت نہوں یا ان کے خلاف عمل کرنے سے دوسروں کو خبر ہو کر بدنامی کا اندیشہ نہو اس وقت تک وہ اخلاق ان کے نزدیک قابل عملدرآمد ہونگے اور اگر کوئی ایسا موقع پیش آجائے گا کہ ان پر عمل کرنے سے دنیوی ضرر ہوتا ہو اور ان کے خلاف کرنے میں کسی کو خبر بھی نہو جس سے دنیوی بدنامی کا اندیشہ ہو تو اس منکر توحید و رسالت کو کبھی ان اخلاق کے ترک کی پرواہ نہو گی چونکہ پھر کوئی قوت اس کو باز نہیں رکھہ سکتی۔ چنانچہ اس اصول کے بنا پر مہذب و شائستہ اقوام میں جن کو اپنے اصول تمدن پر ناز ہے اکثر ایسے ایسے جرائم ہوتے ہیں جو کسی متمدن قوم میں جائز نہیں ہو سکتے۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین سلطنتوں میں معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی پابندی صرف اس وقت تک کی جاتی ہے جب تک ذاتی منافع حاصل ہوتے ہیں یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر ہوتا ہے لیکن اس کے خلاف عہد شکنی میں ذرا تامل نہیں ہوتا۔ لیکن ایک دیندار محض خدا کی وجہ سے کبھی عہد شکنی کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اور معاد کا قائل مستقبل کے خوف سے اپنے ایفائے وعدے میں حتی الوسع کوشاں رہتا ہے۔

فرض کرو کہ دو شخص ہم سفر ہوں جن میں سے ایک کے پاس ایک ہزار کے

نوٹ ہوں اور دوسرا محتاج محض ہو راستہ میں متمول شخص کا انتقال ہو جائے اور مفلس کو اپنے ساتھی کا مال ملجائے اور اس کی خبر بھی کسی کو نہونے پائے تو اس وقت قوت اخلاقیہ اور نفس میں باہم جنگ ہوگی۔ اخلاق کا فتوٰی یہ ہوگا کہ روپیہ وارث مستحق کو دینا چاہیئے اور نفس کا فیصلہ اس کے بالکل خلاف ہوگا۔ اس موقع پر محض اخلاقی تعلیم رہبری کبھی نہیں کر سکتی چونکہ مخلوق کے خوف کا اس کو بالکل اندیشہ نہیں ہے یہاں پر صرف وہی شخص بازی لے سکتا ہے جس کے دل میں خوف خلق کے بجائے خوف خالق جان گزیں ہو اور وہ صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو توحید و رسالت کا قائل ہو۔

اس مثال سے واضح ہو گیا کہ تمدنی زندگی کی تکمیل کے لیے اسلام کی کس درجہ ضرورت ہے مختصر یہ ہے کہ اسلام کے جسقدر اصول ہیں وہ سب اخلاق کی مکمل طور پر تعلیم دیتے ہیں اور غیر متمدن اقوام کو متمدن بنانے کا اصل ذریعہ ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ قوم جسکی کتاب آسمانی رَبِّ زِدْنِی عِلْما کے ورد کی تعلیم دے وہ قوم جس کا نصب العین اطلبوا العلم ولو کان بالصین ہو۔ وہ قوم جو حکمت کو اپنا گم شدہ لال سمجھکر اس کی تلاش میں سرگرداں رہی ہو۔ وہ قوم جس کے طالب علم کی دوات کی سیاہی خون شہدا کا درجہ رکھتی ہو۔

وہ قوم جس کے ہاں ایک علمی مسئلہ کا اخذ کرنا قیام یمن سے بہتر خیال کیا گیا ہو۔ وہ قوم جس کے علمی کارنامجات کا صرف ایک ورق فی المعنی دنیا کے سلف کے تمام کتب خانوں سے افضل واعلیٰ ہو۔ وہ قوم جو بڑی شد و مد سے

پئے علم چوں شمع باید گداخت

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

کی قائل ہو وہ قوم جس نے دنیا کو فنون تاریخ اور اسمائے رجال سے آگاہ کیا ہو اور جس کا ایک معمولی فرد آج اس عالمگیر روشنی کے زمانہ میں ابوالتاریخ کے ممتاز لقب سے ملقب ہو۔ وہ قوم جس نے احمد ہمدانی۔ نشوان بن سعد حمیری صاحب شمس العلوم۔ واقدی۔ ابن اسحاق۔ ابن ہشام۔ ابن قتیبہ۔ بلاذری۔ طبری ابوالفداء۔ ابن اثیر۔ مقری اور ابن خلدون جیسے مورخین پیدا کئے ہوں وہی قوم آج تاریخ عالم تو ایک طرف خود اپنی ہی تاریخ سے لاعلم اور اپنے کارناموں سے محض نابلد ہے۔

اور باوجود ان تمام باتوں کے ہم دیکھتے ہیں یہی مسلم قوم ہر جگہ سب سے زیادہ پستی میں نظر آتی ہے اور ہر چہار طرف سے اس پر لعن وطعن کی بوچھاڑ ہوتی ہے تو اب فطرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس تنزل اور انحطاط کا سبب کیا ہے؟ اس سوال کا حل افراد قوم کی موجودہ حالت کی سیر ہے جب ہم موجودہ قوم کے افراد پر مجموعاً نظر ڈالتے ہیں تو یہ سوال خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ اس وقت مدعیان اسلام

نے بلحاظ تنافر و تخاسد ان تمام اصول اسلامی کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اسلام کے حقیقی شاہراہ سے اپنی جہالت کی تاریکی میں کوسوں دور ہٹ گئے ہیں اس وجہ سے معصیت اور بے دینی کی گھٹائیں اسلامی عالم پر محیط ہیں۔ قومی رسوم اور مغربی معاشرت اس درجہ سرایت کر گئی ہے کہ اپنے اسلاف سے بالکل بیخبر ہیں۔ تمدن۔ وسیاست۔ معاملات و معاشرت اس قدر بگڑ گئے ہیں کہ اکثر زبانیں متفق اللفظ اس کی قائل ہیں کہ اسلام صرف۔ نماز روزہ اور جنت غیبی چیزوں۔ بہشت کی حوروں اور دوزخ کے کیڑوں مکوڑوں کے تذکرہ کا نام ہے انسانی معاش اور گذران حیات یا دیگر ظاہر و باطن اخلاقیات سے کوئی علاقہ ہی نہیں ہے کھانا۔ پینا۔ اٹھنا۔ بیٹھنا۔ ملاقات۔ معاملات حسن سلوک وغیرہ وغیرہ سب سے بالکل آزاد ہیں اگر کبھی تمدنی رسوم میں پابندی بھی کی تو ان اقوام کی جن کو مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اور اگر طرز معاشرت یا انداز نشست و برخاست میں اتباع کیا تو ان کا جو اصلاح کے پردے میں تخریب کے درپے ہیں۔ بجائے اس کے کہ خذ ما صفا دع ما کدر کے اصول پر کاربند ہوں کورانہ تقلید میں اپنے آپ کو برباد کر لیا۔ بددینی کا نام دین۔ بربادی کا نام شادی۔ جہل کا نام علم شعبدے بازی کا نام کرامات ہو گیا ہے نہ اخلاق کی تفہیم نہ الوہیت و رسالت کی تعظیم نہ آداب و مقامات کی تتمیم ہے۔

ہر شخص کو توبہ و خوف۔ زہد و اتقا۔ صبر و شکر۔ اخلاص و صدق۔ توکل و

رضا کی بجائے حسد و بغض بخل وحب مال رعونت وحب جاہ ریا و درشتی بیجا ناز ہے۔

ہم تہذیب و شائستگی۔ روشن خیال و روشن ضمیری کے مدعی ہیں اور کائنات دنیا کے انکشاف کرنے میں شائستہ لوگوں کے مقلد ہیں۔ ہم اسپنسر اور میو ہیڈ کی تمدنی تھیوریوں۔ ڈارون اور ہکسلے کے قائل ہیں۔ کارڈس اور ویرا یش کے سیاسی اور مذہبی مسائل کے مداح ہیں لیکن ہم اپنی اس عظیم الشان آسمانی کتاب اور مقدس اقوال نبوی کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جن کی عجیب وغریب حکمتوں کے دریافت کرنے میں اگر یہ علما اپنی تمام عمریں بھی صرف کر دیں تو ان کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ اگر ہم اپنے مکمل اسلامی قانون کو دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو گوشہ نشینی اور گمنامی۔ تعصبات مذہبی اور ذلت و خواری یا ناقابل برداشت عبادات و ریاضات کا حکم دیتا ہو اور جو موجودہ یا آیندہ تمدن کے منافی ہو بلکہ وہ ایسا مذہب ہے جو محنت و کوشش اور کام کرنیکے لیے انسان کو آمادہ کرتا ہے اور علو ہمتی اور اولوالعزمی کے ساتھ عزت و عظمت رفعت و وقعت حاصل کرنے کی ترغیب و تحریص دیتا ہے۔

اسلام سے قبل اقوام کی جہالت کو غور کرو اور اس کے بعد دیکھو کہ محض اسلام کی وجہ سے ان میں کسقدر عظیم الشان اور فوری تغیر ہو گیا۔ اس گروہ میں ہم کو ایسے لوگ نظر آئیں گے جو بلحاظ پرہیزگاری و وقار فرشتوں سے اور بلحاظ ہمت و اقتدار کسریٰ و قیصر سے فائق ہیں۔ انہوں نے علوم اخلاق اور تمدن معاشرت کی تعلیم کونسی یونیورسٹی

میں پائی تھی؟ یا سیاسی علوم کونسے علمی جلسوں اور پارلیمنٹوں میں سیکھے تھے؟
ان کے قوانین کی تعلیم کے لیے کونسے کالج کھلے ہوئے تھے جہاں سے وہ اسقدر
بلند پایہ متقنن ہوئے کہ دنیا کو متحیر کر دیا اور آج عالم میں ان کی نظیر نہیں ملتی؟ ان
کی ظاہری اور باطنی تعلیم و تربیت کے لیئے صرف وہ ایک آسمانی کتاب تھی جس کو
آج ہم نے پس پشت ڈال رکھا ہے اور دوسروں کے ملمع شدہ قوانین پر کاربند
ہو کر ان کے محتاج ہو رہے ہیں اور قعر مذلت میں گرتے جا رہے ہیں اور یہ نہیں خیال
کرتے کہ ؎

خدا نے آجتک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ اس کا نتیجہ ہے کہ ہم نے جان بوجھ کر الہام الٰہی کی پرواہ نہیں کی ہے جس کے
صریح الفاظ یہ ہیں کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاِذَآ اَرَادَ
اللّٰہُ بِقَوْمٍ سُوْٓءً فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ۔

ہم اگر آج احکامِ خداوندی کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جائیں تو پھر اپنے اسلاف کی
طرح ترقی کے تمام منازل طے کر سکتے ہیں چونکہ ؎

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹	۱۷	براءالعین	برائے العین
۱۰	۵	کردیتا ہے	کردیتا تھا
"	"	ہوتا ہے	ہوتا تھا
"	۱۴	عقلی دماغی	عقلی اور دماغی
۱۱	۴	صدی کے	صدی میں
"	۱۲	ہدات	ہدایت
۱۵	۱۰	درکند	درکُند
"	۱۴	عظیم الجتہ	عظیم الجثہ
۱۹	۱۱	علامہ ریش	علامہ دیریش
"	۱۵	سوکھتے ہو	سوکھتے رہو
۲۱	۲	وہ اعتقادات	یہ وہ اعتقادات
"	۱۱	علامہ جبیلر	علامہ جبیلر
۲۳	۷	کیوں نہ دے	کیوں نہ کرے
"	۱۵	براحت آسائش	براحت و آسایش

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۴	۱۷	نافع اللغیر	نافع لالغیر
۲۸	۷	فضائل سے	فضائل سے مملو ہے
"	۱۱	Philosophy	Philosophers
۲۹	"	رہتے ہیں	رہے ہیں
۳۱	۱۴	ہوجاتا ہے	ہوجاتا ہے تو
"	۱۵	تغذیہ ہوجاتا ہے	تغذیہ بند ہوجاتا ہے
۳۲	۱۱	تمدن کہ	تمدن ہوتا ہے۔ یہ کہ
۳۴	۷	اسی ضروریات	تمام ضروریات
۳۵	۱۴	پاتی ہیں	پاتی ہے
۳۶	۱۲	نہ ہوں گی	نہ ہوگی
۴۱	۱	وصول	حصول
۵۱	۱۴	خابج	خارج
۶۰	۵	برامین	براہین
۶۱	۱۷	دختران کو	دخترانِ خدا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۲	۲	معشرتی	معاشرتی	۸۸	۴	علمی	عملی
؍؍	۱۴	مکہ طلوع	مکہ سے طُلوع	۸۹	۱۲	لغوی	سفوی
۶۳	۱۷	حمیدہ اوصاف	حمیدہ اور اوصاف	۹۰	۶	نغت	لُغات
۶۴	۷	جنسوں	حیثیت	۱۰۰	۵	خنبل	حنبل
؍؍	۱۶	لوگوں	لوگ	۱۰۱	۱۴	چھوڑدں	چھوڑونگا
۶۵	۶	اس	ان میں	۱۰۲	۱۱	ان	ان کی
۶۹	۱	مسٹر	مسز	۱۰۳	۱۱	سرتاآ	سرتاپا
؍؍	۱۷	اکثریہ	اگرچہ	۱۰۷	۱۷	بندرگاہوں	بندرگاہوں کی
۷۱	۱۱	نیتجہ ظلم	نتیجۂ ظلم	۱۲۰	۶	معشرتی	معاشرتی
۷۴	۵	کی	کے	۱۲۲	۱	حضرات نے	حضرات کو
۷۸	۱۷	جلال	حلال	؍؍	۱۰	بھی	یہی
۷۹	۲	بہی	بھی	۱۲۷	۳	میوہیڈ	میورہیڈ
۸۶	۱۴	مشاہد	شاہد	۔	۔	۔	۔